تعلیم و تربیت
دسمبر
2012ء
کہانی نمبر
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com

72واں سال آٹھواں شمارہ | رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

قائداعظم محمد علی جناحؒ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل تھے۔ جب وہ گورنر جنرل ہاؤس میں رہتے تھے تو وہاں غیر ضروری روشن کیے گئے بلب بند کر دیا کرتے تھے۔ ایک دن اُن کو ایسا کرتے دیکھ کر اُن کے سیکرٹری نے کہا کہ جب آپ ایسا کرتے ہیں تو ہمیں شرمندگی ہوتی ہے۔ اس طرح چند بلب بند کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ بات سن کر قائداعظمؒ نے کہا:

''یہ اصول کی بات ہے، پیسے کو ضائع کرنا گناہ ہے اور اگر یہ پیسہ عوام کا ہو تو یہ اور بھی بڑا گناہ ہے۔''

قائداعظمؒ کا یہ طرزِ عمل نہ صرف گورنر جنرل ہاؤس میں بلکہ وہاں بھی ہوتا تھا جہاں آپ مہمان کی حیثیت سے جاتے تھے۔ آپ میزبان کے گھر میں وہ اضافی بلب جو اُن کے لیے روشن کیے جاتے تھے، اُن کو بند کر دیا کرتے تھے۔

دسمبر کا مہینہ ہماری قومی تاریخ میں اس لیے نہایت اہمیت کا حامل ہے کہ اس مہینے کی 25 تاریخ کو ہمارے محبوب رہنما قائداعظم محمد علی جناحؒ پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی کوششوں سے دُنیا کے نقشے پر ایک نیا اسلامی ملک پاکستان وجود میں آیا۔ آپ پاکستان کو ایک مضبوط اور ترقی یافتہ ملک کی صورت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک ہم بہت سے مسائل سے دو چار ہیں جن کے باعث ہم ابھی تک قائد کے پاکستان کو حقیقی معنوں میں قائد کا پاکستان نہیں بنا سکے۔ ابھی بھی وقت کی ڈور ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہم آپس کے تمام اختلافات ختم کر کے مل بیٹھیں تو ہمارے سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہر نعمت ہے، بس ضرورت ہے تو باہم اتحاد کی، جب ہم یک جا ہو جائیں گے تو بہت جلد اپنی منزل پا لیں گے۔ اس مہینے کا یہی پیغام ہے کہ ہم جہاں ہیں اور جو کچھ کر سکتے ہیں ہمیں وہ نہایت محنت اور خلوصِ دل سے کرنا چاہیے تا کہ پاکستان ایک مضبوط اور ترقی یافتہ ملک بن سکے۔

اس وقت ''کہانی نمبر'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس نمبر کے لیے صفحات اور قیمت بڑھانے کی بجائے کچھ مستقل سلسلے روک کر ان کی جگہ کہانیاں شائع کی گئی ہیں۔ جو مستقل سلسلے اس شمارے میں شامل نہیں ہیں وہ ان شاء اللہ اگلے شمارے میں شاملِ اشاعت ہوں گے۔ انعامی مقابلوں کے ''کوپن'' آئندہ ایک ہی صفحہ پر شائع کیے جائیں گے تا کہ کوپن کاٹنے سے رسالے کے صفحات خراب نہ ہوں، یوں آپ اپنا پیارا ''تعلیم و تربیت'' دیر تک سنبھال سکیں گے اور اس کی مزے دار کہانیاں بار بار پڑھتے رہیں گے۔

اب آپ ''کہانی نمبر'' پڑھیے اور اپنی آراء و تجاویز سے آگاہ کیجیے۔

اس شمارے میں

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق: کہانی نمبر

چیف ایڈیٹر	ایڈیٹر، پبلشر	اسسٹنٹ ایڈیٹر	مشیر	سرکولیشن اسسٹنٹ
عبد السلام	ظہیر سلام	نذیر انبالوی	سعید لخت	محمد بشیر راہی

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ ''تعلیم و تربیت'' 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309-36361310 فیکس: 6278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم، لاہور۔

خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔
N: 042-111 62 62 62 Fax: 042-6278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)= 500 روپے۔
مشرقِ وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے)= 1500 روپے۔
ایشیاء، افریقہ، یورپ (ہوائی ڈاک سے)= 1500 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 25 روپے

درسِ قرآن و حدیث

سلام پھیلایئے، نیکیاں کمایئے

محمد طیب الیاس

پیارے بچو!

اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک بہت پیارا اور عمدہ دین عطا کیا ہے، جسے اسلام کہتے ہیں، جس میں تمام ضروری احکامات کو نہایت جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے اور ہمیں ایسے شان دار کام کرنے کا حکم دیا ہے کہ جن کے کرنے سے بہت سی خیر و برکت اور ڈھیروں اجر و ثواب ملتا ہے۔ انہی عمدہ کاموں میں سے ایک ''سلام'' بھی ہے۔

سلام کے پھیلانے اور عام کرنے کے بارے میں قرآن اور حدیث میں بہت تاکید کی گئی ہے اور اس پر جو عظیم بدلہ ملتا ہے اس کو بھی واضح لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کے مسلمان پر چھ حق ہیں، ان میں سے ایک حق یہ بھی کہ جب اس سے ملاقات ہو تو اس کو سلام کرے۔ (مسلم شریف)

اگر آپ نے کسی سے کوئی چیز لینی ہو اور وہ آپ کو دے دے تو آپ کو خوشی ہوتی ہے کہ دیکھو اُس نے وقت پر میری چیز مجھ کو لوٹا دی، اسی طرح چیز دینے والا بھی اپنی جگہ خوش ہوتا ہے کہ میں مالک تک اس کی چیز پہنچا کر سرخرو ہوا، اور یوں آپس میں محبت قائم ہوتی ہے بالکل اسی طرح جب دو سلام کرنے والے ایک دُوسرے کو سلام کرتے ہیں، وہ ایک دُوسرے کا حق ادا کرتے ہیں تو ان کو بھی اسی طرح خوشی ہوتی ہے اور آپس میں محبت پیدا ہوتی ہے۔

احادیث مبارکہ میں سلام کو خوب پھیلانے کا حکم دیا گیا ہے کہ اس کے پھیلانے سے دل صاف ہو جاتا ہے، نفرتیں اور بغض دُور ہوتا ہے، ایمان مضبوط ہوتا ہے۔ یوں جنت تک جانے کا راستہ آسان ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم جنت میں نہیں جا سکتے جب تک مومن نہ ہو جاؤ (یعنی تمہاری زندگی ایمان والی زندگی نہ ہو جائے) اور تم اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک آپس میں ایک دُوسرے سے محبت نہ کرو، کیا میں تمہیں وہ عمل نہ بتا دوں جس کے کرنے سے تمہارے درمیان محبت پیدا ہو جائے؟ (وہ یہ ہے کہ) سلام کو آپس میں خوب پھیلاؤ۔ (مسلم شریف)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور حدیث ہے کہ سلام اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اتارا ہے لہٰذا اس کو آپس میں خوب پھیلاؤ، اس لیے کہ جب کوئی مسلمان کہیں سے گزرتا ہے اور انہیں سلام کرتا ہے اور وہ لوگ اسے جواب دیں تو اس سلام کرنے والے کو ایک درجہ ثواب زیادہ ملتا ہے، اس لیے کہ اس نے انہیں سلام یاد دلایا ہے، اگر وہ لوگ اسے جواب نہ دیں تو ان سے بہتر اور پاکیزہ جواب فرشتہ انہیں دیتا ہے۔

اب یہ سلام کس طرح کیا جائے؟ اس کے لیے اللہ رب العزت کا ارشاد ہے کہ جب تمہیں سلام کیا جائے تو تم اس سے بہتر طور پر سلام کرو یا اسی کو لوٹا دو۔ (النساء:86)

السلام علیکم کا جواب **وعلیکم السلام ورحمة الله** کے ساتھ دینا...... اور...... **السلام علیکم ورحمة الله** کا جواب **وعلیکم السلام ورحمة الله و برکاته** کے ساتھ دینا بہتر طریقہ سے سلام کرنا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **السلام علیکم** پر دس، **السلام علیکم ورحمة الله** پر بیس اور **السلام علیکم ورحمه الله وبرکاته** کہنے پر تیس نیکیاں ملتی ہیں۔

سلام ایک چھوٹا سا عمل ہے مگر اس کے فوائد بے شمار ہیں، اس سے آپس میں محبت پیدا ہوتی ہے، مسلمان بھائی کا حق ادا ہوتا ہے، نیکیاں ملتی ہیں، تکبر (بڑاپن) دُور ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ راضی ہوتے ہیں۔ آپ ان فائدوں کو حاصل کرنے کے لیے سلام پھیلایئے اور نیکیاں کمایئے۔

نوجوان نے ایک نظر کوٹھی پر ڈالی، پھر اُس کی انگلی گھنٹی کے بٹن کی طرف چلی گئی۔ اندر کہیں بہت دُور گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ وہ انتظار کرتا رہا۔ اسے یوں لگا جیسے اب اسے صدیوں انتظار کرنا پڑے گا تب کہیں جا کر یہ دروازہ کھلے گا۔

کوٹھی بہت شان دار تھی...... اس کی ہر ہر چیز سے امارت ٹپک رہی تھی...... یہ صورتِ حال تو صرف باہر کی تھی...... اندر تو نہ جانے کیا حال تھا۔ تنگ آ کر اس نے پھر گھنٹی بجائی۔ اور پھر سے انتظار شروع کر دیا۔ تیسری بار گھنٹی بجانے کے بعد اس نے سوچا...... شاید یہ دروازہ نہیں کھلے گا...... لیکن پھر اس کا خیال غلط ثابت ہو گیا اور اس نے قدموں کی آواز سنی پھر زبردست طریقے سے سجایا ہوا دروازہ کھل گیا۔

سخت سے نقش و نگار والے ایک شخص کی صورت دکھائی دی۔ اس کے کندھے پر ایک کپڑا تھا اور لباس گرد آلود...... اِس سے اُس نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کوٹھی میں ملازم ہے۔

''جی...... کیا بات ہے؟'' اس کے موٹے موٹے ہونٹوں نے حرکت کی۔

وہ شام کا وقت اور گرمیوں کے دن تھے۔ باہر خوب گرمی تھی اور دھوپ بھی دروازے پر پڑ رہی تھی۔

''مجھے سرفراز اجالا صاحب سے ملنا ہے۔''

''وہ سوئے ہوئے ہیں۔'' ملازم نے منہ بنایا۔

''وہ کب تک جاگ جائیں گے؟''

''وہ مغرب کے وقت جاگ جائیں گے۔''

''تو میں انتظار کر لیتا ہوں...... آپ مجھے انتظار گاہ میں بٹھا دیں۔''

''کیا آپ ان کے واقف کار ہیں، کیا وہ آپ کو جانتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں! آج پہلی بار ملاقات کا امکان ہے۔''

''تب آپ باہر ہی کہیں وقت گزار لیں اور سورج غروب ہونے پر یہاں آ جائیں۔''

''اچھی بات ہے۔'' اُس نے قدرے غمگین لہجے میں کہا۔

ملازم نے کھٹ سے دروازہ بند کر لیا...... اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، وہاں کہیں سایہ نہیں تھا...... وہ وہاں سے چل پڑا۔ کافی

دیر تک چلنے کے بعد اسے چائے کی ایک دُکان نظر آئی۔ وہ اس میں جا بیٹھا۔ اس کے کہنے پر بیرے نے جلد ہی چائے کا کپ اس کے سامنے رکھ دیا۔ مغرب کا وقت ہونے تک اس نے چائے کے تین کپ پی ڈالے...... وقت جو گزارنا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے سورج غروب ہو گیا۔ اس نے نزدیک ہی واقع ایک مسجد میں نماز ادا کی اور کوٹھی کی طرف چل پڑا۔

اس مرتبہ پہلی دستک پر ہی دروازہ کھل گیا۔ ملازم نے اسے دیکھ کر سر ہلا دیا...... پھر اشارے سے وہیں کھڑے رہنے کے لیے کہا اور دروازہ بند کر کے اندر چلا گیا...... اس کی واپسی ہوئی تو اس نے کہا: ''آیئے۔''

وہ اس کے پیچھے چلتا ہوا ایک کمرے میں داخل ہوا۔ یہ ڈرائنگ روم تھا...... اس نے دیکھا...... اس پر بھی پیسہ پانی کی طرح بہایا گیا تھا۔ ملازم اسے بٹھا کر چلا گیا...... پندرہ منٹ کے بے چین اور پریشان کر دینے والے انتظار کے بعد آخر ڈرائنگ روم کا اندرونی دروازہ کھلا...... اور ایک بھاری بھرکم ادھیڑ عمر آدمی اندر آ گیا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے اس پر ایک نظر ڈالی جیسے اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو...... پر اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔

''میں آپ کو پہچان نہیں سکا...... کیا نام ہے آپ کا؟''

''کیا آپ سرفراز اجالا ہیں؟''

''جی بالکل......''

سرفراز اجالا صاحب...... آج سے پچیس سال پہلے اس جگہ آپ کی کوٹھی نہیں بلکہ ایک چھوٹا سا مکان تھا۔''

''تو پھر؟'' اجالا کا چہرہ تن گیا۔

''اس وقت آپ کے ساتھ والے مکان میں ایک خاتون رہتی تھیں...... مریم بی بی۔'' نوجوان یہاں تک کہہ کر رک گیا۔

''ہاں ہاں...... رہتی تھی، تو پھر؟'' اب اس نے قدرے چونک کر اور کچھ حیران ہو کر کہا۔

''آپ ایک سنار ہیں، آپ کی صرافہ بازار میں ایک چھوٹی سی دُکان تھی۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ رک رک کر کیوں کہہ رہے ہیں۔'' سرفراز اجالا بے چین نظر آیا۔

''اُس بیوہ خاتون نے آپ کو ایک موتی فروخت کیا تھا......''

''اب اتنی بات مجھے یاد نہیں۔''

''کوئی پروا نہیں...... آپ بس سن لیں...... آپ نے اس موتی کے اس بیوہ خاتون کو بیس ہزار روپے دیے تھے...... آپ کو اب بھی یاد آیا یا نہیں۔''

''نہیں!''

''اس خاتون...... یعنی مریم بی بی نے آپ سے کہا تھا، یہ موتی میری والدہ کا ہے، انہوں نے مجھے دیا تھا اور وہ ایک نواب خاندان سے تعلق رکھتی تھیں...... کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ موتی کی کم قیمت دے رہے ہوں...... اور ہو یہ زیادہ کا...... جواب میں آپ نے کہا تھا...... نہیں میری بہن...... یہ موتی اس سے زیادہ کا نہیں...... آپ بے شک دُوسرے سناروں کو دکھائیں...... اس شریف خاتون نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی...... خاموشی سے وہ بیس ہزار رکھ لیے تھے...... اس کے بعد اس خاتون نے اس پیسوں سے اپنے بیٹے کو پڑھایا...... لکھایا...... یہاں تک کہ وہ ایک سرکاری افسر بن گیا...... اب اس خاتون کو بیٹے کی شادی......''

''اوہو...... آپ یہ سب باتیں مجھے کیوں بتا رہے ہیں...... میرا ان سے کیا تعلق؟ سرفراز اجالا تلملا اٹھا۔

بیٹے کی شادی کا معاملہ پیش آیا تو اس خاتون نے بیٹے سے کہا...... بیٹے میرے پاس ایک موتی ہے...... اگر یہ فروخت کر دو تو ذرا دھوم دھام سے شادی کر سکیں گے...... میں نے کسی زمانے میں بالکل اس کے ساتھ کا ایک موتی بیس ہزار میں فروخت کیا تھا...... اب تو ایک زمانہ بیت گیا...... لہٰذا اس موتی کے بھی ضرور ایک لاکھ یا اس سے کچھ زیادہ مل جائیں گے...... لہٰذا تم یہ بیچ آؤ...... سو جناب بیٹا بازار چلا گیا۔ اس نے وہ موتی ایک جوہری کو دکھایا۔ جوہری اس نوجوان کو اس کے عہدے کے حوالے سے جانتا تھا...... اس نے موتی کو خوب اچھی طرح پرکھ کر کہا ہم آپ کو اس کے ساٹھ لاکھ روپے دے دیں گے...... نوجوان کو یہ سن کر حیرت

ہوئی...... اُس نے جوہری سے پوچھا، آپ کے خیال میں پچیس سال پہلے اس موتی کی قیمت کیا ہو گی...... جوہری نے جوان پر ایک نظر ڈالی...... کیوں کہ اس کا سوال عجیب تھا...... پھر اُس نے حساب لگا کر بتایا...... اس وقت بھی یہ موتی دس لاکھ کا تھا...... سو سرفراز اجالا صاحب، آپ نے اس خاتون سے دھوکہ کیا تھا۔ سراسر ٹھگا تھا...... دس لاکھ کے موتی کے اس غریب کو بیس ہزار روپے دیے تھے...... آج اس خاتون کا بیٹا آپ سے یہ پوچھنے آیا ہے...... آپ کا انصاف اب کیا کہتا ہے......"

"یہ ضروری نہیں کہ وہ موتی اور آپ کی والدہ کا موتی بالکل ایک جیسے ہوں۔"

"تب آپ کو بتانا پڑے گا آپ کی دُکان تو چھوٹی سی تھی جو اب بہت بڑی دُکان ہے، آپ کا مکان تو بالکل چھوٹا سا تھا آپ نے پچیس سال میں اتنی ترقی کیسے کر لی ہے۔"

سرفراز اجالا نے بوکھلا کر اس نوجوان کی طرف دیکھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اُس نے سنا نوجوان کہہ رہا تھا۔

"آپ کے پاس دو راستے ہیں آپ جو پسند کریں اُس کا انتخاب کر لیں۔ میرے دفتر میں آ کر آپ انسٹھ لاکھ اسی ہزار روپے ادا کر دیں ورنہ آپ کو عدالت میں جانا پڑے گا جو راستہ آپ پسند کریں اس کا انتخاب کر لیں۔ یہ رہا میرا کارڈ اس پر میرے دفتر کا پتہ اور فون نمبرز درج ہیں۔"

نوجوان نے اپنا کارڈ اس کو تھما دیا۔ دیکھنے میں بھولا بھالا اور بالکل سیدھا سادھا اور بالکل عام سے لباس والا نوجوان اب اسے ایک تیز طرار، ذہین اور چست و چالاک نظر آ رہا تھا...... اس کی گویا جون ہی بدل گئی تھی۔ اس نے خوف کے عالم میں کارڈ پر ایک نظر ڈالی اُس پر لکھا تھا...... انسپکٹر عادل نعیم...... سی آئی ڈی اسپیشل آفیسر......

نوجوان اٹھ کر جا چکا تھا...... اور سرفراز اجالا کی پیشانی پسینے سے بھیگ چکی تھی۔ اب اُس کے پاس اعترافِ جرم کرنے کے سوا کوئی دُوسرا راستہ نہ تھا۔ انسان جو جرم کرتا ہے اُسے ایک نہ ایک دن ضرور اُس کی سزا بھگتنا پڑتی ہے۔

☆......☆......☆

کہانی ایک چوہے کی

ضیاء الحسن ضیا

بچے سب بولے دادی اماں سے
اِک کہانی ہمیں سنا دیجیے

ہو مزہ اور سبق کہانی میں
اِس کہانی سے ہم بھی کچھ سیکھیں

دادی اماں یہ بولیں اے بچو!
اپنے مطلب کی تم کہانی سنو

ایک چوہے کو سخت بھوک لگی
بیٹھے بیٹھے اُسے نئی سوجھی

سوچا اُس نے کسی دُکاں میں چلوں
اِس طرح اپنا خالی پیٹ بھروں

پہنچا جب وہ دُکان کے اندر
ہر طرف پھر رہا تھا خوش ہو کر

ایک بوری میں تھے چنے جو بھرے
اُس نے کچھ کھائے اور کچھ کُترے

پاس چینی کی بوری آئی نظر
سونگھنے اُس کو لگ گیا جا کر

ساری بوری کو اُس نے کاٹ دیا
ساری چینی کا اُس نے ناس کیا

مختلف چیزیں خوب کھاتا رہا
اِس قدر کھایا ہو گیا موٹا

پھر دُکاں کو وہ گھر سمجھنے لگا
ہو کے بے فکر اُس میں رہنے لگا

ایک دن سو رہا تھا بوری پر
بلی کی پڑ گئی جو اُس پہ نظر

اُس نے سوچا کہ موقع ہے اچھا
اُس پر جھپٹی، جھپٹ کے دے مارا

چوہا چوری پہ اپنی پچھتایا
مُفت خوری کا یہ مزہ پایا

خوبصورت
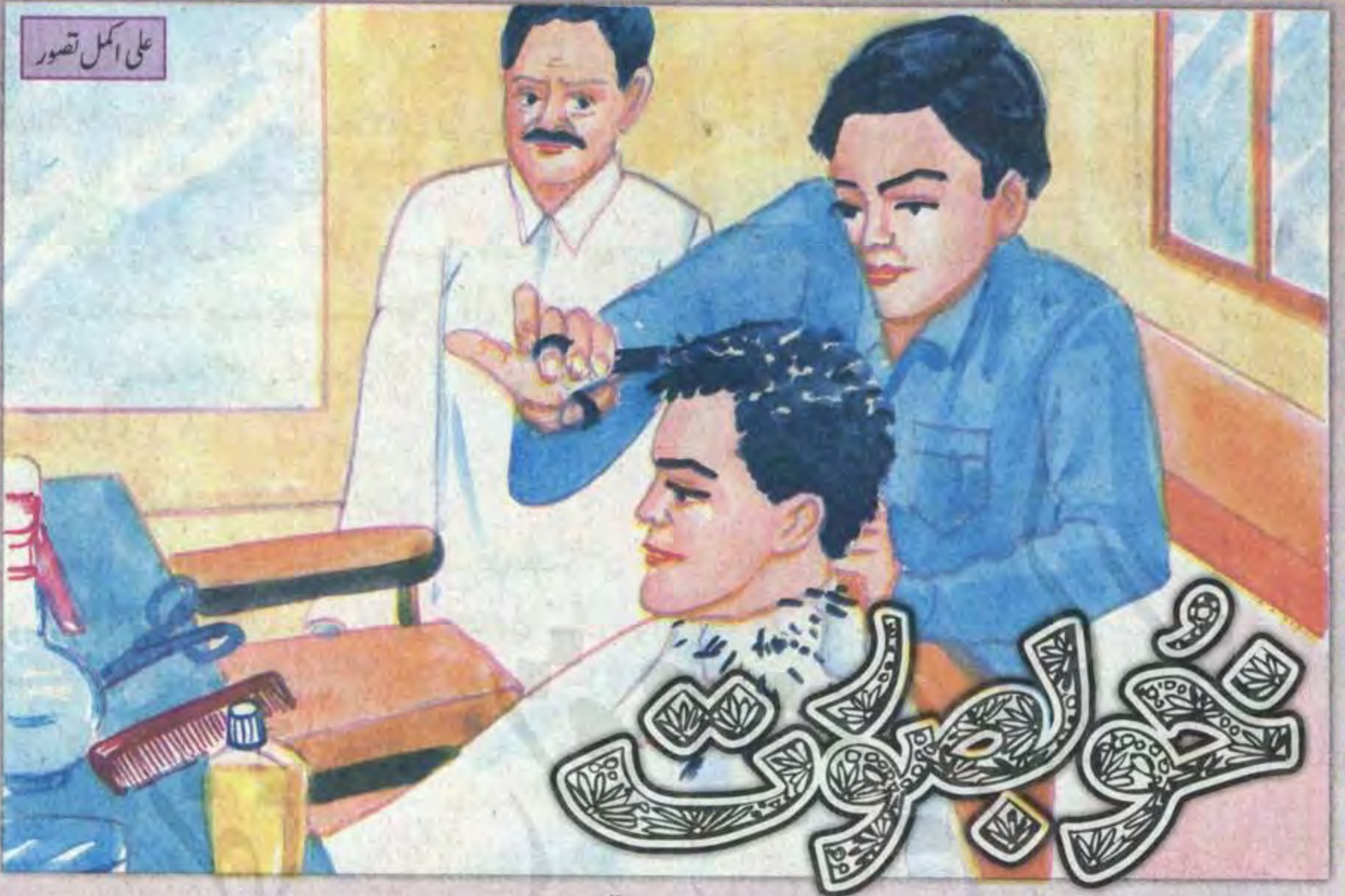
بوبی حجام اپنی دُکان پر پہنچا تو اُس نے دیکھا ایک آدمی اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس آدمی کے بال گھنگھریالے تھے۔ خشک گھاس کی مانند اُس کے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ مونچھیں لبوں سے نیچے آ رہی تھیں اور ڈاڑھی کے بال بھی بڑھے ہوئے تھے۔ اس کی جلد چکنی تھی۔ چہرے پر موجود گرد کی تہہ اُس کی رنگت کو سیاہی مائل بنا رہی تھی۔

''کیا حال ہے استاد جی!'' دُکان میں داخل ہوتے ہی بوبی نے اپنے استاد کو مخاطب کیا۔ نواب پہلے ہی جلا بھنا بیٹھا تھا۔

''میرے حال کو چھوڑ پہلے اس کا حال درست کر......'' نواب نے اُس آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تیز آواز میں کہا۔ نواب کا مزاج خراب تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ اس آدمی سے کہہ رہا تھا کہ تمہاری حجامت میں بنا دیتا ہوں، لیکن وہ اپنی بات پر اڑا ہوا تھا کہ میں اپنے بال بوبی سے ہی کٹواؤں گا۔ اس کے کسی دوست نے بوبی سے حجامت بنوائی تھی۔ اور پھر اُس کے سامنے بوبی کی تعریف کر ڈالی تھی۔ اس کے بال گھنگھریالے تھے۔ ایسے بال ہر کسی حجام کی پکڑ میں نہیں آتے۔ وہ جانے کتنے ہی حجاموں سے حجامت بنوا چکا تھا لیکن آج تک اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ آج وہ بوبی کی کاری گری پر کھنے آیا تھا۔ بوبی نواب کو استاد جی کہتا تھا، لیکن حقیقت میں نواب، بوبی کا استاد نہیں تھا۔ بوبی، نواب کے ایک دوست کا شاگرد تھا۔ نواب کے پاس کوئی کاری گر نہیں تھا تو اس کے اصرار پر بوبی، نواب کے پاس آ کر کام کرنے لگا تھا۔ بوبی اُسے دل سے استاد جیسی عزت دیتا تھا۔ بوبی کی نیت اچھی تھی اور وہ خلوص کے ساتھ اپنا کام کرتا تھا تو پھر دیکھتے ہی دیکھتے بوبی نے نواب کی دُکان پر اپنی ایک جگہ بنا لی۔ ہر گاہک بوبی سے کام کروانا پسند کرتا تھا۔ نواب کو اب فرصت ہی فرصت تھی اُس کا دل جلتا تھا، لیکن کام اچھا چل رہا تھا تو یہ بات سوچ کر وہ سمجھوتہ کر لیتا تھا۔

''آیئے جناب......'' بوبی نے اس آدمی کو کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ اُس کے لہجے میں بہت مٹھاس تھی۔ وہ گھومنے والی کرسی پر سکون سے بیٹھ گیا۔

''جناب آپ کا نام؟'' بوبی مسکرایا۔

''میں کمال ہوں......'' اُس آدمی نے بھی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''یہ تو کمال ہو گیا، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں، میرا

مطلب ہے، آپ بالوں کو کیسا زاویہ دینا پسند کریں گے، بال سیدھے کر دوں یا پھر اس طریقے سے کاٹوں کہ آپ کی پیشانی پر بالوں کی ایک لٹ ہمیشہ لہراتی رہے......''

''بوبی! یہ باتیں چھوڑو...... میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں، میرا چہرہ لمبوترا ہے، میرے چہرے کے مطابق کوئی بھی انداز بنا دو......'' کمال نے دو جملوں میں کہانی ختم کر دی تھی اب بوبی چونک اٹھا۔

''آپ تو اس کام کو سمجھتے ہیں جناب......''

''ہاں...... بالوں کے حوالے سے آج تک کوئی مجھے مطمئن نہیں کر سکا، اب تمہارا امتحان ہے۔'' کمال کی بات بوبی کے فن کو کھلا چیلنج تھی۔ بوبی نے سر ہلا کر اس چیلنج کو قبول کر لیا۔

''میرے کام کی تعریف وہ لوگ کریں گے جن کے درمیان آپ رہتے ہیں۔ اپنا چشمہ اتار دیجیے......''

کمال نے چشمہ اتار کر بوبی کے حوالے کر دیا۔ بوبی نے کمال کی گردن کے گرد کپڑا لپیٹ دیا۔ اس کپڑے نے کمال کے کپڑوں کو ڈھانپ دیا تھا۔ پھر بوبی نے ایک بوتل پکڑی۔ اس بوتل کے منہ پر فوارہ لگا ہوا تھا۔ فوارے کی مدد سے بوبی نے کمال کے بالوں کو نمی دی۔ اور پھر تولیے کی مدد سے سر کو ڈھانپ دیا۔ نواب کی دُکان کا ماحول پُرسکون تھا۔ کرسی بھی آرام دہ تھی۔ کمال کو نیند آنے لگی تھی۔ پانچ منٹ کے بعد بوبی نے تولیہ ہٹا دیا اور پھر کنگھی اور قینچی پکڑ کر کمال کے بالوں کو تراشنے لگا۔ کمال نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ یہ کام تو بوبی کا تھا۔ اُسے تو بس نتیجہ دیکھنا تھا۔ بوبی کمال کے بالوں پر اپنا کمال دکھا رہا تھا۔ وہ کبھی استرا پکڑ لیتا۔ اور کبھی دندانے والی قینچی سے مدد لیتا تھا۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ کمال سوتے جاگتے کی کیفیت میں تھا کہ اُس کے کانوں سے بوبی کی آواز ٹکرائی۔

''کمال بھائی! ڈاڑھی کا کیا کرنا ہے......''

''کرنا کیا ہے...... سب صفا چٹ کر دو......'' کمال کی آواز میں غنودگی تھی۔ اب بوبی کا استرا کمال کے چہرے پر رقص کر رہا تھا۔ اپنا کام مکمل کرنے کے بعد بوبی نے ہاتھوں پر کریم لگا کر کمال کے چہرے کا مساج کیا۔ پھر اُس نے کمال کا چشمہ اُس کے حوالے کر دیا۔ کمال نے چشمہ لگایا اور پھر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ دُوسرا لمحہ قیامت خیز تھا۔ کمال زور سے چیخا اور پھر اُس نے بوبی کا گریبان پکڑ لیا۔

''احمق آدمی یہ تم نے کیا کر دیا......''

غصے کی شدت سے کمال کی آواز پھٹ گئی تھی۔

''میں نے کیا کیا ہے، کچھ بھی تو نہیں...... ذرا دیکھیے تو آپ کتنے خوب صورت لگ رہے ہیں......'' بوبی گھبرا گیا تھا۔

''خوب صورت کے بچے...... تم نے میری مونچھیں مونڈ دی ہیں۔'' کمال کی آواز میں دُکھ تھا۔

''آپ نے ہی تو کہا تھا کہ سب صفا چٹ کر دو......'' بوبی بولا۔

''میرا مطلب ڈاڑھی سے تھا...... مونچھوں سے نہیں...... اور اگر صفا چٹ کا مطلب یہی ہے تو تم نے میری بھنویں کیوں چھوڑ دیں...... انہیں بھی صاف کر دیتے......'' کمال نے اب بوبی کا گریبان چھوڑ دیا تھا۔

''اب میرے دوست احباب میرا مذاق اڑائیں گے۔ اب میں کیسے اُن کا سامنا کروں گا......''

''کوئی مذاق نہیں اڑائے گا۔ میرا کام اُس سنگ تراش جیسا ہے جو فالتو پتھر ہٹا دے تو مجسمہ سامنے آ جاتا ہے، میں لوگوں کو خوب صورت بناتا ہوں یہی میرا کام ہے۔ اور یہ بات آپ کے دوست احباب آپ کو بتائیں گے.....'' بوبی رنجیدہ ہو گیا تھا۔ اُس نے دل لگا کر کام کیا تھا، لیکن نتیجہ منفی نکلا تھا۔ اب کمال نے آئینے کی طرف دیکھا۔ اُس کا دل چاہا کہ وہ بوبی سے کہے۔

''کیا یہ میں ہی ہوں......'' لیکن وہ خاموش رہا۔ آئینہ اُسے بتا رہا تھا کہ وہ اب بہت خوب صورت نظر آ رہا تھا۔ کمال سر جھکائے دُکان سے باہر نکل گیا۔ نواب تیکھی نظروں سے بوبی کو گھور رہا تھا۔ دونوں کے پاس بات کرنے کے لیے اب کوئی موضوع نہیں تھا۔ دس منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک لڑکا دُکان میں داخل ہوا۔ نواب کسی کام کے سلسلے میں دُکان سے باہر چلا گیا تھا۔

''انکل! حجامت بنا دیجیے۔'' ایک لڑکا دُکان میں داخل ہوا۔

''کیسی؟'' بوبی نے مختصر بات کی تھی۔

''مشینی کٹ......'' وہ لڑکا بولا تو بوبی ہنس پڑا۔

''یہ مانا کہ گرمی کا موسم ہے، لیکن تمہارے گھر والے بُرا منائیں گے۔ بالکل چھوٹے بال انہیں پسند نہیں آئیں گے۔''

بوبی نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''انکل، آپ فکر مت کیجئے...... میں امی ابو سے پوچھ کر آیا ہوں......'' لڑکے کی یہ بات سن کر بوبی مطمئن ہو گیا۔ اُس نے مشین پکڑی اور ایک طرف سے رکھ کر سارے بال اڑا دیئے۔ آخر میں استرے کی مدد سے اُس نے بالوں کی نوک پلک سنوار دی۔ لڑکا خوشی خوشی واپس لوٹ گیا۔ کچھ دیر بعد بوبی نے شور کی آواز سنی۔ کوئی رو رہا تھا اور ساتھ میں کوئی چیخ چیخ کر باتیں کر رہا تھا۔ بوبی نے دیکھا وہ لڑکا جو مشینی کٹ کروا کر گیا تھا۔ روتے ہوئے چلا آ رہا تھا۔ اُس کے باپ نے اُس کا بازو تھام رکھا تھا۔ اُن کی منزل بوبی کی دُکان تھی۔ لوگوں کا ایک ہجوم دُکان کے سامنے جمع ہو گیا تھا۔ لڑکے کا باپ بہت غصے میں تھا۔ وہ بدتمیزی کے ساتھ بول رہا تھا۔

''نالائق...... الو...... میرے بیٹے کا حلیہ بگاڑ دیا۔ کام کرنا نہیں آتا تو دُکان کھول کر کیوں بیٹھے ہو......'' ایک دن میں بوبی کے ساتھ یہ دُوسرا المیہ ہو چکا تھا۔

''جناب! بچے نے جیسا کہا میں نے کام کر دیا۔ اس میں میری غلطی کیا ہے......''

بوبی نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

''کیا کہا تھا بچے نے، اس نے کہا تھا مشینی کٹ کرو...... میرے بچے کو گنجا کر دیا ہے۔''

بچے نے اپنے باپ کے ڈر سے جھوٹ بول دیا تھا۔ بوبی بھی نہیں چاہتا تھا کہ بچے کی مزید پٹائی ہو...... خاموشی میں ہی بہتری تھی، لیکن اس خاموشی کا اثر الٹا ہوا۔ اب بچے کے باپ کے ساتھ ساتھ نواب بھی بوبی پر چیخ رہا تھا۔ اُس کی اتنے دنوں سے دبی جلن باہر آ رہی تھی۔ جلد بازی اور غصے میں نواب نے بوبی کو جواب دے دیا۔

''میری دُکان سے نکل جاؤ۔ جانے تمہارا دھیان کہاں رہتا ہے۔ مجھے ایسا کاری گر نہیں چاہیے جو کاروبار کا بیڑا غرق کر دے......''

بوبی سر جھکائے دُکان سے باہر نکل آیا۔ سب لوگ اُس کی حالت پر افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔ بوبی کو شرمساری تو محسوس ہو رہی تھی، لیکن اس کا دل مطمئن تھا۔ پھر ہجوم چھٹ گیا۔ اب نواب گاہکوں کے انتظار میں تھا۔ پھر ایک نوجوان دُکان میں داخل ہوا۔

''بوبی کہاں ہے؟''

''وہ آج چھٹی پر ہے۔'' نواب نے جھوٹ بولا۔

''تو پھر میں کل آ جاؤں گا......'' نواب اُس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ کتنے ہی لوگ بوبی کا پوچھ پوچھ کر واپس لوٹتے رہے۔

''کیا مجھے کام نہیں آتا۔ میں نے اس کام میں اپنی زندگی کے بیس سال گزارے ہیں...... پھر کیا بات ہے، کیا وجہ ہے...... کوئی مجھ سے کام کیوں نہیں کرواتا......'' نواب یہ باتیں سوچ سوچ کر سلگ رہا تھا کہ اتنے میں کمال آ گیا...... وہی کمال...... صبح بوبی نے

جس کی مونچھیں مونڈ ڈالی تھیں۔ اس کا چہرہ خوشی کی شدت سے چمک رہا تھا۔

''بوبی کہاں ہے؟'' اُس نے نواب سے پوچھا۔

''وہ چھٹی پر ہے۔''

''میں اپنے رویے پر اُس سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ وہ لوگوں کو خوب صورت بنانے کا فن جانتا ہے۔ میں اس بات کو اب سمجھا ہوں۔ آپ اُس سے یہ بات کہہ دیجیے گا......'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور نواب سوچوں میں گم ہو گیا۔ اُس نے جلد بازی میں بوبی کو کام سے جواب دے دیا تھا، لیکن اُس کے بغیر دُکان کیسے چلے گی۔ وہ تو کسی بھی جگہ کام کر کے روزی کما لے گا، لیکن نواب...... نواب اپنے کام کو کیسے چلا پائے گا۔ نواب کی سوچوں کا سلسلہ اُس وقت ٹوٹا جب ایک لڑکا نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

''انکل! بوبی کہاں ہے۔ میں مشینی کٹ کروانا چاہتا تھا، لیکن ابو اس حق میں نہیں تھے۔ اور پھر پٹائی سے بچنے کے لیے میں نے جھوٹ بولا۔ آپ انکل بوبی کو واپس لے آیئے۔ ان کی کوئی غلطی نہیں ہے......''

''ہاں میرے بچے میں اُسے واپس لے آؤں گا۔ تم فکر مت کرو......''

نواب نے بوبی کو واپس لانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پھر وہ لڑکا مسکراتے ہوئے دُکان سے باہر نکل گیا۔

اس رات نواب، بوبی کے گھر پر آیا۔ بوبی بہت دُکھی تھا۔ نواب نے بوبی سے واپس آنے کی گزارش کی تو بوبی بولا۔

''میں نے اب فیصلہ کر لیا ہے کہ میں یہ کام نہیں کروں گا۔ میں اگر واپس اپنے استاد کے پاس جاتا ہوں تو اس میں آپ کی توہین ہو گی اور اگر کسی جگہ کام کرتا ہوں تو اس میں بھی آپ کی توہین ہو گی۔ اس لیے اب میں یہ کام نہیں کروں گا۔ مجھے اپنی عزت کا بھی خیال ہے اور آپ کی عزت کا بھی احساس ہے......''

نواب شرمندہ ہو گیا۔ وہ بوبی کے پاس اپنے مفاد کے لیے آیا تھا، لیکن بوبی کو اب بھی اُس کی عزت کا احساس تھا۔ اُس کے وجود میں موجود مفاد کا بت ایک جھٹکے میں پاش پاش ہو گیا تھا۔

''بوبی تمہیں واپس لوٹنا ہو گا۔ میری دُکان اب تمہاری ہے اور اسے تم ہی سنبھالو گے......'' نواب کے لہجے میں یقین کی چمک تھی۔

''میں نہیں لوٹوں گا۔ میں مزدوری کر لوں گا، لیکن میں اب یہ کام نہیں کروں گا......'' بوبی کا ارادہ مضبوط تھا۔ نواب واپس لوٹ آیا۔ وہ جانتا تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے اور پھر اُس نے وہی کیا۔

وہ رات بوبی نے سوتے جاگتے کی کیفیت میں گزاری تھی۔ اُسے نئے سرے سے کام کا آغاز کرنا تھا۔ دُنیا میں زندہ رہنا ہے تو کام کرنا پڑے گا۔ وہ اس بنیادی اصول سے آگاہ تھا، لیکن کون سا کام...... وہ اس نکتے پر سوچ رہا تھا۔ یا تو انسان تعلیم کی بنیاد پر روزی کماتا ہے۔ یا تو پھر ہنر اس کی روزی کا وسیلہ بنتا ہے۔ تیسری صورت مزدوری کی ہوتی ہے۔ بوبی نے مزدوری کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ریلوے اسٹیشن کے پاس مزدور جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہاں سے ٹھیکے دار مزدوروں کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اب اُسے کام کی تلاش میں اپنے گھر سے نکلنا تھا کہ اُس کے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ بوبی نے دروازہ کھولا اور پھر وہ حیران رہ گیا۔ اُس کی گلی میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ بوبی اُن سب کو جانتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے کبھی نہ کبھی بوبی سے حجامت بنوائی تھی۔ ڈاڑھی منڈوائی تھی۔ ڈاڑھی کا خط بنوایا تھا۔ ان میں جوان بھی تھے، بچے بھی تھے اور بوڑھے بھی تھے۔ سب سے آگے کمال تھا۔

''تم کام نہیں کرو گے تو ہمیں خوب صورت کون بنائے گا......'' کمال نے بوبی کا ہاتھ تھام کر کہا۔ بوبی کی آنکھیں سلگنے لگیں تھیں۔

''کمال کرتے ہو کمال بھائی......'' بوبی سسک پڑا۔ نواب دُور کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اُس نے رات بھر میں یہ کام کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب بوبی کہیں نہیں جا پائے گا۔ اور اُسے اپنے اس سوال کا بھی جواب مل گیا تھا کہ سب بوبی سے ہی کیوں حجامت بنواتے ہیں۔ کیوں کہ بوبی کے پاس ایک خوب صورت ضمیر تھا۔ اسی لیے تو وہ جسے ہاتھ لگاتا تھا وہ بھی خوب صورت بن جاتا تھا۔

☆......☆......☆

کڑوی روٹی

جدون ادیب

وہ ایک قبائلی علاقہ تھا۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں اچانک ایک بزرگ کہیں سے چلے آئے۔

گاؤں کے لوگوں نے بڑی محبت اور خوش دلی سے انہیں ''ہرکلہ راشہ''، یعنی جب جی چاہے، جب جب چاہو آؤ کہا۔

قبائلی لوگ تو ویسے بھی بہت مہمان نواز ہوتے ہیں مگر وہ دینِ اسلام کی اشاعت کے لیے آنے والوں کی آمد پر بہت خوش ہوتے ہیں۔ ہر گھر سے ملحقہ مہمان خانہ ضرور ہوتا ہے۔

بزرگ کی آمد پر جہاں سب کو خوشی ہوئی، وہیں یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ ان کی مہمان نوازی کا شرف کیسے ملے گا۔

ایسے بزرگ اچانک آتے اور اچانک چلے جاتے ہیں۔ یہ بات وہ بھی جانتے تھے، پھر یہ طے ہوا کہ جب تک وہ گاؤں میں ہیں مسجد کے مولوی صاحب فیصلہ کریں گے کہ وہ کس کے ہاں ٹھہریں گے۔ پھر مولوی صاحب نے تین دن کے لیے گھروں کا فیصلہ کرلیا۔

پہلے دن بزرگ گاؤں کے ملک فضل خان کے مہمان بنے۔ بزرگ سے پوچھ لیا گیا کہ کیا وہ بڑے مہمان خانے میں قیام کریں گے یا پھر ان کی خواہش اور خوشی کے لیے ان کے گھروں پر ٹھہریں گے۔ بزرگ نے فیصلہ سنایا کہ وہ فضل خان کے حجرے میں رہیں گے۔

بزرگ نے عصر اور مغرب کی نماز مسجد میں ادا کی۔ مغرب کے بعد فضل خان کے گھر میں بزرگ کے اعزاز میں دعوت تھی۔ فضل خان نے اپنی حیثیت کے مطابق بزرگ کے لیے دنبہ اور سارے گاؤں والوں کے لیے ایک جوان اور تندمند بیل ذبح کروایا۔

بزرگ نے گاؤں والوں کے ساتھ کھانا کھایا۔ انہوں نے شوربے والی روٹی اور ابلے ہوئے نمکین گوشت کو بہت پسند کیا۔ وہ گاؤں والوں کو کھانا کھاتا دیکھ کر بہت خوش تھے اور فضل خان اور گاؤں والوں کے حق میں دُعا کر رہے تھے۔

کھانے کے بعد فضل خان کے وسیع و عریض حجرے میں قہوے کی محفل سجی۔ گاؤں والے منتظر تھے کہ بزرگ اپنا تعارف کروائیں اور اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔ بزرگ نے اپنی گفتگو کا آغاز فضل خان اور گاؤں والوں کے شکریے اور ان کے لیے دُعاؤں سے کیا پھر انہوں نے بتایا کہ وہ تین دن کے بعد چلے جائیں گے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ مذہبی احکام کی تشریح کا فریضہ سر انجام دیتے ہیں اور لوگوں کو سمجھاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکام،

نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، قرآن مجید اور دیگر عقائد کا کیا فائدہ ہے۔ مثلاً ہم روزے رکھتے ہیں اور سختی سے اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں مگر بہت کم لوگ سوچتے ہیں کہ یہ روزہ ہمارے لیے کیوں فرض کیا گیا ہے۔ روزہ رکھنے کے ہمیں کیا جسمانی، روحانی اور سماجی فوائد حاصل ہو رہے ہیں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ آپ کو بتاؤں کہ آپ کے ہر نیک عمل کا ایک خوب صورت ردِعمل ہوتا ہے۔ اگر آپ اس کو جان جائیں گے تو مذہبی تقاضے مزید سہل طریقے سے ادا کرسکیں گے۔

گاؤں کے لوگوں نے بزرگ کی باتوں میں بہت کشش محسوس کی۔ پھر بزرگ نے گاؤں کے لوگوں کو کچھ کہنے کی دعوت دی اور یہ محفل کافی دیر تک چلی۔ دُوسرے دن بزرگ نے پورا گاؤں گھوم پھر کر دیکھا۔

انہوں نے یہ بات نوٹ کی کہ گاؤں میں کچھ گھرانے بہت غریب ہیں۔ ان کی آمدنی کے ذرائع کم اور افراد کی تعداد زیادہ ہے۔ بزرگ بہت دیر تک ان لوگوں کی مدد کے طریقوں پر غور کرتے رہے۔ بزرگ کا تعلق بھی انھی علاقوں سے تھا اور وہ جانتے تھے کہ یہاں کے لوگ بہت غیرت مند اور خوددار ہوتے ہیں۔ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ کوئی ان پر ترس کھائے اور نہ وہ اپنی غربت اور بھوک کے بارے میں کسی کو بتاتے ہیں۔ بزرگ نے آخر ان کی مدد کی ایک انوکھی ترکیب سوچ لی۔

انہوں نے گاؤں کے لوگوں کو جمع کیا اور انہیں صدقہ اور خیرات کی اہمیت سے آگاہ کیا۔ یہ بھی سمجھایا کہ اگر خوش حالی اور تونگری چاہیے تو اپنا ہاتھ کھلا اور دل کشادہ رکھنا ہوگا۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ ہر صاحبِ حیثیت فرد اپنے تندور کی پہلی روٹی اللہ کے نام پر خیرات کرے۔ سب یہ فیصلہ کرلیں کہ وہ پہلی روٹی کس کو دیں گے اور غریب اس روٹی کو اپنے لیے عزت اور اللہ کا انعام سمجھ کر لے تاکہ کوئی بھوکا نہ سوئے۔ کم پیٹ بھر کر کھانے والے بھی پیٹ بھر کر کھائیں۔
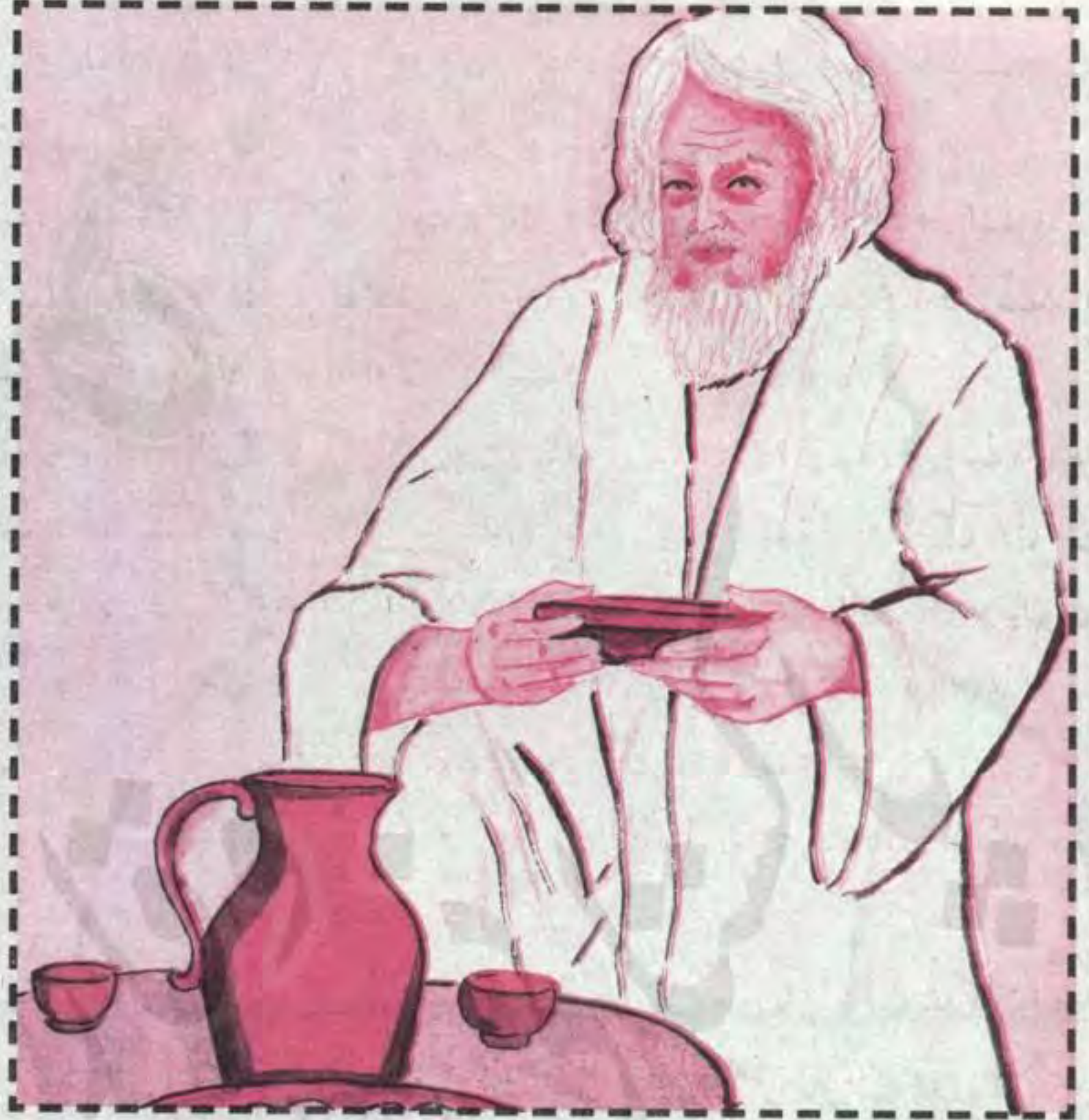
گاؤں کے لوگوں نے بزرگ سے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کریں گے۔ اگلی صبح بزرگ فجر کی نماز پڑھ کر گاؤں سے چلے گئے۔

دن گزرا، شام کو تندور گرم ہوئے اور روٹیاں پکیں۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ روٹی خیرات کرنے سے ہر آدمی جھجکا۔ ہر کسی نے خیال کیا کہ وہ کل سے یہ کام شروع کرے گا، آج تو اور بہت سے لوگ ایسا کرگزریں گے۔ اس دن جب لوگ کھانا کھانے بیٹھے تو یہ دیکھ کر حیران اور خوف زدہ ہوگئے کہ ان کی روٹیاں کڑوی ہوچکی تھیں۔

گاؤں کے لوگ بڑے حجرے میں جمع ہوئے۔ وہ شرمندہ تھے کہ انہوں نے بزرگ سے کیا ہوا عہد نہیں نبھایا۔

سیانوں نے مشورہ دیا کہ بزرگ سے معافی مانگنی چاہیے۔ دو بہادر نوجوان گھوڑوں پر سوار ہوکر بزرگ کی تلاش کے لیے روانہ ہوئے۔

جب دونوں گھڑ سوار جنگل سے گزر رہے تھے تو انہوں نے

بزرگ کو ایک درخت کے نیچے جائے نماز بچھائے نماز پڑھتے دیکھا۔ قریب ہی لکڑیوں کے چھوٹے سے ڈھیر میں آگ جل رہی تھی اور بزرگ کی چھوٹی سی کیتلی میں قہوہ تیار ہو رہا تھا۔

دونوں نوجوان واقعی بہت بہادر تھے۔ وہ سارے گاؤں والوں کی شرمندگی کا بوجھ اٹھا لائے تھے۔ بزرگ نے انہیں قہوہ پلایا اور آمد کا سبب پوچھا تو دونوں بزرگ کے پیروں میں گر گئے اور گاؤں والوں کی اجتماعی وعدہ خلافی پر معافی مانگنے لگے۔ بزرگ نے دونوں کو سینے سے لگایا اور کہا کہ انہوں نے کوئی بددُعا نہیں دی، بعض معاملات خدائی ہوتے ہیں اور ہر خطا ہر بھول ہر گناہ کا حل معافی ہے اور وہ بھی گاؤں والوں کو معاف کرتے ہیں۔

جنگل گاؤں سے تین گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ بزرگ نے انہیں واپس جانے کا حکم دیا۔ اُدھر گاؤں میں بھوک سے بلکتے ایک بچے نے کڑوی روٹی توڑ کر کھائی تو پتا چلا کہ روٹی تو اب کڑوی نہیں رہی۔ سب لوگوں نے کھانا کھایا اور خدا کا شکر ادا کیا۔

اسی دن پتا چلا کہ بابو موچی کے بیوی بچے آج بھوکے سوئے تھے۔ انہیں بھی نیند سے اٹھا کر کھانا دیا گیا۔

بہادر نوجوان لوٹ آئے۔ گاؤں کے نوجوانوں نے اپنے ساتھیوں کا استقبال نعروں سے کیا۔ بزرگ نے نوجوانوں کے عزم اور حوصلے کی تعریف کی۔

پھر گاؤں والے بدل گئے۔ اگلے دن سے انہوں نے وہی کیا جو بزرگ نے کہا تھا۔ ہر کسی نے اپنے تندور کی پہلی روٹی کسی غریب کو دے دی۔ یوں جو غریب تھے، انہیں کافی روٹیاں مل گئیں۔ اللہ نے ان کی خیرات قبول کر لی اور غریبوں کو ان کی عزتِ نفس مجروح ہوئے بغیر کھانا نصیب ہوا۔

گاؤں والوں کی دیکھا دیکھی دُوسرے گاؤں اور پھر سب قبائلیوں نے اس نیکی کو اختیار کر لیا۔

لوگوں نے اپنے تندور کی پہلی روٹی کو کڑوی روٹی کا نام دے دیا۔ یعنی انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ پہلی روٹی کو اپنے لیے کڑوی روٹی سمجھیں گے اور اسے خیرات کر دیا کریں گے۔

قبائلی آج بھی اپنے تندور کی پہلی روٹی اللہ کی راہ میں دیتے ہیں اور صدیوں سے یہ رسم چلی آ رہی ہے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو یہ کڑوی روٹی کھانے کا موقع ملے تو کسی قبائلی کے گھر کے باہر مغرب سے ذرا پہلے کھڑے ہو جائیں۔ آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ ایک بچہ یا بچی ایک بڑی سی روٹی لے کر باہر نکلے گا اور اگر آپ انہیں اشارہ کر دیں گے تو وہ روٹی آپ کو دے دیں گے۔

یہ کڑوی روٹی بہت خستہ، نمکین اور مزے دار ہوتی ہے۔ اس روٹی کی بہت عزت، بہت مان ہوتا ہے۔ یہ روٹی نصیب والوں کے ہاتھوں نصیب والوں کو ملتی ہے۔

چچا تیز گام نے گاڑی چلائی

''ابو! سردیوں کی چھٹیاں ہونے والی ہیں، اس مرتبہ آپ ہمیں کہاں گھمانے لے جائیں گے؟'' عروج نے سوال کیا۔

''بیٹی، آپ کہاں گھومنے جانا چاہتی ہیں؟'' چچا تیز گام اپنی بیٹی سے بہت پیار کرتے تھے۔

''ابو! آپ ہمیں اس مرتبہ چڑیا گھر لے کر جائیے گا۔'' عروج فوراً بولی۔

''آپ کے ابو، محمود، عروج، استاد اور جمن کو چڑیا گھر کس طرح لے جائیں گے؟'' بیگم نے پوچھا۔

''بھئی! کیا مطلب کس طرح ...... ظاہر سی بات ہے کہ ہم اپنی اکلوتی موٹر سائیکل پر بچوں کو بٹھا کر لے جائیں گے۔'' چچا کو اپنی ۳۰ سال پرانی موٹر سائیکل پر فخر تھا۔

''آپ کی موٹر سائیکل کئی سال سے بے کار کھڑی ہوئی ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ چار پہیوں والی سواری لے لیں وہ زیادہ محفوظ ہوتی ہے۔'' بیگم چاہتی تھیں کہ چچا تیز گام گاڑی خرید لیں۔

''ٹھیک ہے، ہم موٹر سائیکل میں دو پہیے اور لگا لیتے ہیں، لیکن اپنی پیاری موٹر سائیکل کو نہیں چھوڑیں گے۔'' چچا تیز گام گاڑی لینے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔

''جمن، جلدی سے اِدھر آؤ اور پھرتی سے ہماری لاڈلی موٹر سائیکل سٹور روم سے نکال کر لاؤ، آج ہم اس کی صفائی کریں گے۔'' چچا تیز گام نے جمن کو حکم دیا۔

جمن اور استاد موٹر سائیکل کو بڑی مشکل سے کھینچ کر صحن میں لے کر آئے۔ دونوں کے کپڑوں پر زنگ اور گرد لگ گئی تھی۔

''آپ اس کی صفائی نہ کریں، یہ تو بہت ہی زنگ آلود ہو رہی ہے۔'' استاد اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے کہنے لگے۔

''صفائی نہ کروں تو پھر کیا کروں، ہمیں اس پر بیٹھ کر اور تم سب لوگوں کو بٹھا کر چڑیا گھر جانا ہے۔'' چچا بولے۔

''ایک منٹ چچا، ذرا ایک منٹ میری بات سنیں۔ آپ کو چڑیا گھر جانا ہے تو میں آپ کو ایک اچھی سی گاڑی دلوا سکتا ہوں۔'' استاد نے کپڑا چچا کے ہاتھ سے لے لیا۔

''گاڑی خریدنا تو ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ آٹھ، دس گاڑیاں خریدنا ہمارے لیے کوئی مشکل بات نہیں، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں گاڑی چلانا نہیں آتی ہے۔'' چچا کہنے لگے۔

''ایسا کریں کہ آپ کسی ڈرائیونگ سیکھانے والے سکول میں

داخلہ لے لیں۔'' استاد بولا۔
''ہیں ......کیا کہا......؟ ہم اور سکول ،کیا اب ہم بچوں کی طرح بستہ اُٹھائے سکول جاتے اچھے لگیں گے؟'' چچا ڈرائیونگ سکول کو کسی پرائمری سکول کی طرح سمجھ رہے تھے۔
''آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں ،ڈاکٹر شعلہ ہیں نا۔'' جمن بولے۔
''کیا وہ ڈرائیور ہیں...... یا کسی سکول کے پرنسپل ہیں؟''
''نہ وہ ڈرائیور ہیں اور نہ وہ کسی سکول کے پرنسپل،البتہ وہ آپ کو ڈرائیونگ سکھا سکتے ہیں۔''
جمن نے ڈاکٹر شعلہ کو فون کیا اور بتایا کہ چچا تیز گام ڈرائیونگ سیکھنا چاہتے ہیں۔یہ بات سن کر ڈاکٹر شعلہ بہت خوش ہوئے اور فون پر کہنے لگے:''سچ جانیے مجھے تو بہت خوشی ہوئی کہ چچا تیز گام گاڑی چلانا سیکھنا چاہتے ہیں۔ میرا ایک دوست اپنی ایک اچھی سی گاڑی فروخت کرنا چاہتا ہے ،ان شاء اللہ تعالیٰ میں کل دوپہر اپنے دوست سے گاڑی لے کر آؤں گا ، پہلے اس پر ڈرائیونگ سیکھ لیں اور مناسب لگے تو خرید لیں۔'' فون پر ہی ڈاکٹر شعلہ نے اگلے دن کا پروگرام طے کرلیا اور گاڑی کا انتظام کرنے کی ذمہ داری لے لی۔
اگلے دن ڈاکٹر شعلہ اپنے دوست سے گاڑی لے کر آگئے ۔چچا تیز گام اُوپر، نیچے ،آگے اور پیچھے غرض ہر طرف سے گاڑی کا مشاہدہ کرنے لگے ۔جمن ،استاد اور حکیم فر فر بھی گاڑی کو دیکھ رہے تھے۔
''ڈاکٹر شعلہ تم کہتے تھے کہ میرے دوست کی بہت اچھی گاڑی ہے،لیکن مجھے یہ نہ اچھی لگتی ہے اور نہ ہی گاڑی لگتی ہے۔''
چچا تیز گام گاڑی کو دیکھ کر حیرت زدہ تھے۔
''لگتا ہے کہ گاڑی درخت سے کچی ہی توڑ لی ہے ،ابھی پکنے میں کچھ وقت ہے۔'' جمن کو بھی گاڑی میں خامیاں نظر آئیں۔
''اس ڈبے کو گاڑی کہنا گاڑی کی توہین ہے،اگر کسی اصلی گاڑی نے سن لیا تو ناراض ہوجائے گی۔'' حکیم فر فر بولے۔
''قبلہ آپ سب کیوں بے چاری گاڑی کا مذاق اُڑا رہے ہیں،آپ کو اس کی حقیقت معلوم نہیں ہے۔ مجھے گمان ہوتا ہے کہ یہ آج سے دس ہزار سال پہلے موہنجوڈارو کے باشندے استعمال کرتے تھے۔'' استاد نے کہا۔
''آپ کیسی احمقانہ باتیں کرتے ہیں ،دس ہزار سال پہلے پیٹرول دریافت نہیں ہوا تھا ،تو پھر یہ گاڑی کس طرح چلتی تھی؟'' چچا تیز گام بولے۔
''آپ ٹھیک کہتے ہیں ،اس زمانے میں پیٹرول دریافت نہیں ہوا تھا ،لیکن اس قسم کی گاڑی کے لیے کسی پیٹرول کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ تو دھکوں سے اسٹارٹ ہوتی ہے۔'' استاد کے پاس جواب موجود تھا۔
''چچا تیز گام ،آپ گاڑی میں بیٹھیں گے بھی یا پھر میں گاڑی واپس لے جاؤں؟'' ڈاکٹر شعلہ جو کافی دیر سے سب کی باتیں سن رہے تھے ،برہم ہوگئے۔
''اچھا بھئی ،آپ ناراض مت ہوں ،ابھی گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں ،ذرا دروازہ تو کھولیں ۔'' چچا تیز گام نے ڈاکٹر شعلہ کا غصہ ٹھنڈا کیا۔
ڈاکٹر شعلہ نے دروازہ کھولنے کے لیے ہینڈل کو کھینچا تو وہ ٹوٹ کو ہاتھ میں آگیا ۔استاد نے بہت زور لگایا ،لیکن دروازہ نہیں کھلا، لگتا تھا کہ کافی عرصے سے دروازہ کھولا نہیں گیا۔ آخر استاد کھڑکی کے راستے گاڑی کے اندر گیا اور اندر سے زوردار کک مار کر دروازہ کھولا۔
''یہ نئے ماڈل کی گاڑی ہے نا ......اس لیے اس کا دروازہ اندر سے کھولنا پڑتا ہے۔'' ڈاکٹر شعلہ بولے۔
''ڈاکٹر شعلہ، کھڑکی میں شیشے کیوں نہیں ہیں؟'' جمن سر کھجاتے ہوئے بولا۔
''گاڑی میں تازہ اور ٹھنڈی ہوا آتی رہے ،اس لیے اس کی کھڑکیوں میں شیشے نہیں لگوائے ،آج کل مہنگائی بہت ہوگئی ہے اب کون گاڑیوں میں اے سی لگوائے۔'' ڈاکٹر شعلہ نے وضاحت کی۔
بقیہ تین دروازے بھی اسی طرح کھول کر تمام لوگ گاڑی میں بیٹھ گئے ،ڈاکٹر شعلہ ڈرائیور کی جگہ بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگے لیکن گاڑی اسٹارٹ نہیں ہوئی۔اچانک ڈاکٹر شعلہ کے دماغ نے کام کرنا شروع کیا اور وہ گویا ہوئے:

"جمن، حکیم تم دونوں کھا کھا کر موٹے ہوگئے ہو، موٹا آدمی بہت جلدی بیمار ہوجاتا ہے اور اس کی زندگی بھی مختصر ہوتی ہے۔"

"ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو، میری امی جان بھی یہی کہتی ہیں، اس موٹاپے سے بچنے کے لیے میں کیا کروں؟" جمن کو موٹاپے کا سن کر پسینے آگئے۔

"میں نے تو اپنا وزن کم کرنے کے لیے ورزش بھی شروع کردی ہے۔" حکیم فرفر بھی نفسیاتی طور پر اپنے آپ کو موٹا سمجھنے لگے تھے۔

"بہت آسان علاج ہے، تم دونوں نیچے اُتر کر گاڑی کو دھکا لگاؤ، اس طرح تمھارا موٹاپا بہت جلد کم ہوجائے گا۔" ڈاکٹر شعلہ چاہتے تھے کہ یہ دونوں گاڑی کو دھکا لگائیں۔

موٹاپے کے علاج کا سن کر دونوں گاڑی سے فوراً اُترے اور گاڑی کو دھکا لگا کر ایک خالی میدان میں لے آئے، تاکہ چچا کو گاڑی چلانا سکھائی جائے۔

چچا تیز گام کو گاڑی میں بیٹھنے سے خوف آرہا تھا، لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتے تھے۔

"دوستو! اب دیر بہت ہوگئی ہے، آج ہم گھر چلتے ہیں، کل ڈرائیونگ سیکھ لیں گے۔" چچا تیز گام اپنا خوف چھپارہے تھے۔

"نہیں چچا تیز گام، بہت مشکل سے یہ شان دار گاڑی ملی ہے، پھر دوبارہ نہ جانے کب ملے۔" ڈاکٹر شعلہ نے فوراً کہا۔

"چچا آپ گھبرائیے مت، اس گاڑی میں اب تک جتنے لوگوں کے حادثے ہوئے ہیں وہ سب کے سب سکون سے سورہے ہیں۔" ڈاکٹر شعلہ بولے۔

"تم سمجھتے کیوں نہیں ہو، میرے پیارے دوست، میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں ...... کہ" چچا تیز گام نے اپنے بال پکڑ لیے، پھر تھوڑی دیر سوچ کر کہنے لگے:

"دیکھو، عروج اور محمود کے امتحانات ہونے والے ہیں، مجھے بچوں کو امتحانات کی تیاری کروانی ہے۔" چچا تیز گام نے ڈرائیونگ سے جان چھڑانے کا اگلا حربہ استعمال کیا۔

"ان کی تو سردیوں کی چھٹیاں ہوگئی ہیں، آپ کون سے امتحانات کی بات کررہے ہیں؟" جمن نے بھی چچا تیز گام کی ایک نہ چلنے دی۔ سب کی خواہش تھی کہ چچا گاڑی ضرور چلائیں۔

جب چچا تیز گام کے سارے بہانے ختم ہوگئے، ان کی ایک نہ چلی تو وہ ڈرتے ڈرتے گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے۔

"بھئی یہ گاڑی کا ایک پہیہ یہاں کیوں لگا ہوا ہے؟" چچا نے پوچھا۔

"یہ پہیہ نہیں، بل کہ اسٹیرنگ ہے، اس سے گاڑی کی سمت کو قابو میں کرتے ہیں۔" ڈاکٹر شعلہ کسی ماہر ڈرائیور کی طرح بتانے لگے۔

"اچھا ...... اچھا، وہ ...... اصل میں مجھے تو معلوم ہی تھا، ہمارے باپ دادا نے بہت سی گاڑیاں چلائی ہیں، میں تو تمھارا امتحان لے رہا تھا۔"

"یہ گاڑی کیسے چلے گی؟" چچا تیز گام نے اگلا سوال کیا۔

"آپ گاڑی کو چابی سے اسٹارٹ کریں گے تو پھر چلے گی نا۔" ڈاکٹر شعلہ بولے۔

"یہ کیا بات ہوئی، اب گاڑی بھی ہم ہی چلائیں، ہم تو بڑی بڑی بسوں، ریل گاڑیوں بل کہ ہوائی جہاز میں بھی سفر کرچکے ہیں، یہ سب گاڑیاں تو ہم اسٹارٹ نہیں کرتے، بل کہ خود ہی چل پڑتی ہیں۔" چچا تیز گام نے اپنے ہاتھ جیبوں میں رکھ لیے۔

ڈاکٹر شعلہ نے بڑی مشکل سے چچا تیز گام کی منت سماجت کر کے گاڑی اسٹارٹ کروائی۔ ڈاکٹر شعلہ چچا تیز گام کے ساتھ اگلی سیٹ پر جب کہ جمن، استاد، حکیم فرفر پچھلی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔

"چچا کلچ پر پاؤں رکھ کر آہستہ آہستہ دبائیں۔"

"مجھے کلچ نظر نہیں آرہا، کیا موٹر سائیکل کی طرح کلچ بائیں ہاتھ کی طرف ہوتا ہے؟"

"نہیں، نہیں، وہ نیچے کی طرف دیکھیں، وہ رہا۔"

"لیکن یہ تو چپٹا ہے، موٹر سائیکل میں تو گول ہوتا ہے، مجھ سے تو نہیں دبتا، تم خود ہی دباؤ۔"

ڈاکٹر شعلہ اپنے پاؤں سے کلچ دبانے لگے تو چچا نے بھی اپنا پاؤں ان کے پاؤں پر رکھ کر زور سے دبادیا۔

''آہ، چچا میرا پاؤں کیوں دبادیا۔'' ڈاکٹر شعلہ درد سے چلا اُٹھے۔

'' اب آپ بائیں ہاتھ سے گیئر لگائیں ۔'' ڈاکٹر شعلہ نے سمجھایا۔

چچا نے گیئر کو بائیں ہاتھ سے پکڑ کر تیزی سے آگے کی طرف بڑھایا تو ان کی کہنی ڈاکٹر شعلہ کے جبڑے پر زور سے لگی۔

''اُف ،میرا جبڑا......، چچا آپ کیا کررہے ہیں؟'' ڈاکٹر شعلہ اپنا جبڑا سہلانے لگے۔

''تم نے ہی تو کہا تھا کہ گیئر لگاؤ، تو میں نے لگادیا۔''

''گیئر لگانے کا کہا تھا، جبڑے پر مکا لگانے کا نہیں کہا تھا۔''

ڈاکٹر شعلہ نے بہت تگ و دو کے بعد چچا کو گاڑی چلا کر دی۔ چچا نے دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھ دیے۔گاڑی جھٹکے کھا کھا کر چلنے لگی۔

'' یہ گاڑی جھٹکے کھا کھا کر کیوں چل رہی ہے؟'' جمن نے اچھلتے اچھلتے پوچھا۔

'' مجھے لگتا ہے کہ یہ گاڑی نہیں ہے ،بل کہ کوئی اونٹ ہے۔'' استاد نے کہا۔

''نہیں بھئی ،دراصل گاڑی کے پیٹ میں درد ہورہا ہے ۔'' حکیم فرفر کوتو بس بیماریوں اوردوا کی ہی سوجھتی تھی۔

ڈاکٹر شعلہ نے دُوسرا گیئر خودلگادیا۔ اب گاڑی کی رفتار تھوڑی تیز ہوئی اور جھٹکے لگنا کم ہوگئے۔

''چچا قریب میں ہڈیاں جوڑنے ولا کوئی ہسپتال ہے؟'' حکیم فرفر نے پوچھا۔

''نہیں ،ہسپتال تو بہت دُور ہے۔'' چچا تیز گام نے پیچھے مُڑ کر جواب دیا ،کیوں کہ گاڑی میں پیچھے دیکھنے والا شیشہ نہیں تھا۔

'' تو پھر آپ گاڑی آہستہ چلائیں ،ہم یہاں سے صحیح سلامت گھر جانا چاہتے ہیں۔''

'آہستہ کیسے چلائیں ،ہمارے مزاج میں توسستی ہے ہی نہیں، ہم تو ہرکام آناً فاناً کرتے ہیں ۔'' چچا نے یہ کہہ کر گاڑی کی رفتار مزید بڑھادی۔

'' آہستہ، چچا تیز گام ،آہستہ......'' سب کہنے لگے۔

'' وہ دیکھیں، سامنے ایک بڑی بس آرہی ہے۔'' جمن کو ڈر لگ رہا تھا۔

'' آنے دو بس کو ،ہم بے بس نہیں ہیں ،آج ہم اس کو بھی دیکھ لیں گے ۔'' چچا نے گاڑی کی رفتار اور بڑھادی۔

'' چچا دیکھنے کے قابل رہیں گے تو پھر دیکھیں گے نا۔'' حکیم فرفر نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

'' چچا ایسا کریں گاڑی کو اُڑا کر بس کے اُوپر سے لے جائیں۔'' استاد کہنے لگا۔

'' گاڑی تو نہیں اُڑ سکتی ،البتہ حادثے کے بعد ہماری روحیں ضرور بس کے اُوپر سے اُڑتی ہوئی جائیں گی۔'' حکیم فرفر کو محسوس ہورہا تھا کہ ان کی زندگی کے دن پورے ہوگئے ہیں۔

'' اس میں بریک کہاں ہوتی ہے؟'' اب تو چچا تیز گام بھی گھبراگئے۔

'' نیچے دیکھیں ،وہیں کہیں ہو گی۔'' ڈاکٹر شعلہ نے نیچے کی طرف اشارہ کیا۔

'' چچا مجھے ابھی کچھ دیر پہلے کوئی چیز ٹوٹ کر باہر گرنے کی آواز آئی تھی۔'' حکیم فرفر نے انکشاف کیا۔

'' کیا بریک ٹوٹ گئی، اب گاڑی کس طرح رکے گی؟''

'' آپ لوگ بلاوجہ پریشان نہ ہو وہ بریک ٹوٹنے کی آواز نہیں تھی ،بل کہ انجن کا ایک پرزہ کم زور تھا وہ نکل گیا ہے۔'' استاد نے پرزہ گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

ڈاکٹر شعلہ خطرے کو بھانپتے ہوئے گاڑی کو موڑ کر دُوسری طرف لے گئے اور یوں وہ بس کی ٹکر سے بال بال بچ گئے۔

'' بھئی ڈاکٹر شعلہ وہ سامنے کی طرف جو ٹریفک کانسٹیبل کھڑا ہے ،کہیں تمھارا رشتہ دار تو نہیں ہے؟''

'' آپ کو کیسے پتا کہ وہ میرا رشتہ دار ہے؟''

'' وہ دیکھو تمھیں کافی دیر سے سلام کررہا ہے۔''

'' وہ سلام نہیں کررہا ،بلکہ ہمیں رکنے کا اشارہ کررہا ہے۔''

'' کانسٹیبل کو کہہ دو کہ ہم جب چل پڑتے ہیں تو پھر رکتے

نہیں ہیں۔''

''چچا ہم ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کررہے ہیں اور ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کرنا جرم ہے۔'' جمن کہنے لگا۔

''میں نے کب قوانین کی خلاف ورزی کی، میں تو گاڑی روکنا چاہتا ہوں ،لیکن یہ رُکتی نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ جب پیٹرول ختم ہوجائے گا تو یہ خود بخود رُک جائے گی۔''

ڈاکٹر شعلہ نے بریک پر پاؤں رکھ کر دبایا جس سے گاڑی رُک گئی۔ اتنے میں ٹریفک کانسٹیبل گاڑی کے پاس آیا اور کہنے لگا:

''دادا جان ،گاڑی کونے میں کھڑی کریں اور ذرا اپنا ڈرائیونگ لائسنس دکھائیں۔'' ٹریفک کانسٹیبل برہم تھا۔

''کیا کہا دادا جان...... ،ارے پوری دُنیا ہمیں چچا تیز گام کہتی ہے، چچا تیز گام۔'' چچا، دادا جان کا لفظ سن کر خفا ہو گئے تھے۔

'' آپ چچا ہوں یا ماموں اس سے مجھے کیا لینا ہے ،البتہ آپ جیسے گاڑی چلا رہے تھے ،اس سے لگتا ہے کہ آپ تیز گام ضرور ہیں۔''

ٹریفک کانسٹیبل کے اصرار پر چچا نے اپنا ۳۰ سال پرانا موٹر سائیکل کا لائسنس دکھایا۔

''یہ تو بہت پرانا لائسنس ہے اور وہ بھی موٹر سائیکل کا ہے۔'' ٹریفک کانسٹیبل بولا۔

'' میرا خیال ہے کہ جن افسروں نے یہ لائسنس بنایا ہوگا ،وہ اپنی قبروں میں سکون کی نیند سو رہے ہوں گے ،آپ کا چالان ہوگا جی۔'' ٹریفک کانسٹیبل اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

'' چالان......اُف میرے اللہ، یہ کیا ماجرا ہوگیا۔'' چالان کا سن کر چچا کے پسینے چھوٹ گئے۔

''آج پہلا دن ہے ہماری ڈرائیونگ سیکھنے کا، مجھے کیا خبر تھی کہ آج ہی چالان ہو جائے گا، کانسٹیبل صاحب کچھ رعایت کر دیں۔'' چچا تیز گام نے التجائیہ انداز اپنایا۔

''آپ کا چالان ضرور ہوگا، گاڑی بھی ضبط ہوگی اور......''

''اور کیا؟'' چچا تیز گام بولے۔

''اور آپ کو ایسی گاڑی کو سڑک پر لانے کے جرم میں گرفتار بھی کیا جائے گا۔''

کانسٹیبل کی یہ بات سن کر چچا تیز گام نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گاڑی سے چھلانگ لگائی اور سر پر پاؤں رکھ کر گھر کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ چچا کے بھاگنے کی رفتار گاڑی سے بھی زیادہ تھی۔

کسی شہر میں ایک غریب عورت رہا کرتی تھی۔ نام تھا اُس کا سلیمہ۔ وہ بہت محنتی اور کفایت شعار تھی۔ کئی سال پہلے اس کا شوہر ایک حادثے میں فوت ہو گیا تھا۔ اس کے دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ اس کی اور اس کے بچوں کی گزر بسر کا واحد ذریعہ ایک گائے تھی۔ سلیمہ گائے کا ایک وقت کا دودھ فروخت کر دیتی اور دُوسرے وقت کے دودھ میں سے کچھ بچوں کو پلا کر اور کچھ آپ پی کر، باقی جما دیتی تھی۔ اس طرح اُسے اور اس کے بچوں کو دودھ کے علاوہ لسی اور مکھن بھی میسر آ جاتا تھا۔ چوں کہ وہ بڑی کفایت شعار تھی، اس لیے کچھ نہ کچھ مکھن اس کے پاس بچ بھی رہتا تھا جسے وہ اسے گرم کر کے گھی بنا لیتی اور جب سیر دو سیر گھی جمع ہو جاتا تو اسے بیچ کر اپنے گھر کے لیے ضرورت کی چیزیں خرید لیتی۔

سلیمہ کے گھر کے بالکل سامنے ایک امیر آدمی کی عالی شان حویلی تھی۔ یہ امیر جس کا نام راحیل تھا، شہر میں کاروبار کرتا تھا اور قریب کے دیہات میں اس کی زمینیں بھی تھیں۔ اس کی حویلی میں ایک نہ دو پوری پانچ بھینسیں تھیں، لیکن ان کا دودھ اور گھی حویلی کے اندر ہی کھپ جاتا تھا۔ کچھ تو اس لیے کہ راحیل خود بھی بہت پیٹو تھا اور کچھ اس لیے کہ اس کی بیوی نجمہ پرلے درجے کی پھوہڑ اور فضول خرچ تھی۔ پوچھنے اور حساب لینے والا کوئی تھا ہی نہیں۔ اس لیے وہ بلا کھٹکے پیسے کی جگہ روپیہ اور چھٹانک کی جگہ سیر خرچ کر ڈالتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ ہنڈیا میں گھی ڈالنے کے لیے برتن اٹھاتی تو گھی ندارد۔ ایسے میں وہ سلیمہ کے گھر کا رُخ کرتی اور اس سے تھوڑا سا گھی مانگ لاتی، ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتی:

''فکر نہ کرنا سلیمہ، دو ایک روز میں تمہارا گھی واپس کر دوں گی۔''

مگر وہ دو ایک روز کبھی نہ آنے پائے تھے۔ چند ہی روز بعد نجمہ کو پھر تھوڑے سے گھی کی ضرورت پڑ جاتی تھی اور وہ سلیمہ سے اور گھی اُدھار لینے آ جاتی تھی۔

نجمہ کی طرف سے گھی اُدھار لینے کا یہ ڈراما ہر چوتھے پانچویں روز دُہرایا جانے لگا اور شرافت کی ماری سلیمہ اُسے گھی اُدھار دیتی رہی، لیکن آخر کب تک۔ ایک روز جب نجمہ گھی اُدھار لینے آئی تو سلیمہ نے تنگ آ کر کہہ ہی دیا:

''دیکھو نجمہ! اب تم مجھ سے پانچ سیر گھی اُدھار لے چکی ہو یا

تو یہ گھی واپس کرو یا اس کی قیمت ادا کرو۔ میں اتنی امیر نہیں ہوں کہ تمھیں روز روز گھی دیتی رہوں۔''

سلیمہ کے یہ الفاظ سن کر نجمہ کے جیسے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ غصے سے کہنے لگی:

''چل ری چل۔ بڑی آئی اُدھار دینے والی، کبھی تُو نے پانچ سیر گھی کی شکل دیکھی ہے؟''

اس کے یہ الفاظ سن کر سلیمہ حیران رہ گئی۔ کہنے لگی: ''تو کیا تم میرے احسان کا اب یہ بدلہ دینے لگی ہو کہ اُدھار لیے ہوئے گھی سے ہی مکر گئیں؟''

نجمہ چمک کر بولی: ''کبھی شکل بھی دیکھی ہے اپنی شیشے میں؟ تُو اور مجھ پر احسان کرے! کیا الٹا زمانہ آ گیا ہے! دو ٹکے کی عورت ہم لاکھوں میں کھیلنے والوں پر احسان دھرتی ہے۔'' اور یہ کہتے ہوئے وہ پیر پٹختی ہوئی چلی گئی۔

اس واقعے کے بعد یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ نجمہ گھی اُدھار لینے یا اُدھار کی رقم ادا کرنے کے لیے سلیمہ کے گھر آئے۔ ایک دن سلیمہ خود ہی حوصلہ کر کے نجمہ کے ہاں گئی اور پانچ سیر گھی کے پیسوں کا مطالبہ کیا تو نجمہ نے اسے دھکے دے کر گھر سے نکلوا دیا۔

جب سلیمہ نے یہ دیکھا کہ نجمہ کسی طرح اپنا اُدھار بے باق کرنے کے لیے تیار نہیں بلکہ اُدھار ہی سے صاف مکر گئی ہے تو مجبور ہو کر اس نے شہر کے قاضی سے فریاد کی کہ راحیل کی بیوی نجمہ مختلف وقتوں میں مجھ سے گھی اُدھار لیتی رہی ہے، جس کی مقدار پانچ سیر بنتی ہے۔ مہربانی کر کے مجھے یہ گھی یا اس کی قیمت اس سے دلوائی جائے۔ قاضی نے نجمہ کو اپنی عدالت میں طلب کیا اور اس سے کہا:

''اس عورت نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ تُو مختلف وقتوں میں اس سے گھی اُدھار لیتی رہی ہے، جس کی مقدار پانچ سیر بنتی ہے، اور اب یہ چاہتی ہے کہ تُو یا تو یہ گھی واپس کرے یا اس کی قیمت ادا کرے۔ تُو اس بارے میں کیا کہتی ہے؟''

نجمہ نے جواب دیا: ''آپ انصاف کی کرسی پر بیٹھے ہیں، خود ہی انصاف سے کہیے کہ مجھے اس عورت سے گھی لینے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا شوہر لاکھوں کا کاروبار کرتا ہے۔ اس کی اپنی زمینیں ہیں۔ میری حویلی میں ایک نہ دو پوری پانچ بھینسیں ہیں، جو دودھ دیتی ہیں۔ پانچ بھینسوں کے دودھ گھی کے ہوتے ہوئے مجھے کیا پڑی ہے کہ اس عورت سے گھی اُدھار لوں جس کے پاس صرف ایک گائے ہے اور وہ بھی مریل سی، یہ پانچ سیر گھی مجھے اُدھار دینے کی بات کر رہی ہے، اس نے کبھی شکل بھی دیکھی ہے پانچ سیر گھی کی؟''

اب قاضی نے سلیمہ سے پوچھا: ''کیا یہ سچ ہے کہ تمہارے پاس صرف ایک گائے ہے؟''

''جی ہاں۔'' سلیمہ نے جواب دیا۔

قاضی نے پھر پوچھا: ''اور یہ بھی سچ ہے کہ نجمہ کی حویلی میں پانچ بھینسیں ہیں؟''

''جی ہاں۔'' سلیمہ نے جواب دیا۔

''پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ نجمہ نے تم سے گھی اُدھار لیا ہو؟''

''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں، میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ نجمہ ہر چوتھے پانچویں روز مجھ سے گھی اُدھار لے جاتی تھی، یہاں تک کہ اس کی مقدار پانچ سیر ہو گئی اور جب میں نے اُس سے کہا کہ یا تو گھی واپس کرو یا اس کے پیسے دو تو یہ صاف مکر گئی۔''

''تمہارا کوئی گواہ ہے؟''

قاضی کا یہ سوال سن کر سلیمہ کہنے لگی۔ ''قاضی صاحب، میرا گواہ صرف خدا ہے۔''

قاضی نے یہ سن کر مقدمے کی سماعت ملتوی کر دی اور دونوں عورتوں کو اگلے روز آنے کا حکم دیا۔

دُوسرے دن نجمہ اور سلیمہ قاضی کی عدالت میں حاضر ہونے کے لیے کچہری کے دروازے پر پہنچیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ اس کے صحن میں کیچڑ پڑی ہوئی ہے۔ دروازے پر ایک سپاہی کھڑا تھا۔ اُس نے دونوں سے کہا:

''قاضی صاحب کا حکم ہے کہ آپ اپنے جوتے یہیں اتار دیں

اور ننگے پیر اندر جائیں۔''

دونوں نے جوتے اتار دیے اور پائنچے چڑھا کر کیچڑ میں سے گزرنے لگیں۔ سلیمہ نے تو کوئی خاص تکلیف محسوس نہ کی، لیکن نجمہ نے بڑی ناک بھوں چڑھائی۔ مگر وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ قاضی کا حکم جو تھا۔

کیچڑ میں سے گزر کر جب وہ دونوں قاضی کے سامنے پہنچیں تو اس نے ایک سپاہی کو حکم دیا: ''ان کو پاؤں دھونے کے لیے پانی دیا جائے۔''

سپاہی نے پانی کا ایک ایک لوٹا بھر کر ان دونوں کے ہاتھ میں تھما دیا۔ سلیمہ نے اپنی کفایت شعاری کی عادت کے مطابق ایک ہی لوٹے سے دونوں پاؤں دھو لیے، بلکہ اس کے بعد بھی لوٹے میں کچھ پانی بچ رہا۔ لیکن نجمہ نے لوٹے کا سارا پانی اک ہی پاؤں پر ڈال دیا اور پھر مزید پانی مانگا۔ سپاہی نے اُسے ایک لوٹا اور بھر کر دے دیا۔

جب وہ پیر دھونے اور جوتے پہننے کے بعد قاضی کے سامنے پیش ہوئیں تو قاضی نے نجمہ سے کہا:

''اے عورت! سلیمہ اپنے دعوے میں سچی ہے۔ اس لیے عدالت کی طرف سے تمھیں حکم دیا جاتا ہے کہ اسے پانچ سیر گھی یا اس کی قیمت فوراً ادا کر دو!''

''یہ تو آپ ظلم کر رہے ہیں، حضور!'' نجمہ نے گڑگڑا کر کہا۔

''میں نے ظلم نہیں، انصاف کیا ہے اور تمھارے ہاتھوں اور پیروں کی گواہی لینے کے بعد کیا ہے۔''

''ہاتھوں اور پیروں کی گواہی؟'' نجمہ نے حیران ہو کر کہا۔

قاضی نے مسکراتے ہوئے کہا: ''ہاں، تمھارے ہاتھوں اور پیروں کی گواہی۔ بہ ظاہر جس عورت کے گھر میں پانچ بھینسیں دودھ دینے والی موجود ہوں، اسے اس عورت سے گھی اُدھار لینے کی ضرورت پیش نہیں آ سکتی، جس کے پاس صرف ایک گائے ہو۔ میں نے سارے معاملے پر غور کرنے کے بعد عدالت کے صحن میں کیچڑ کروا دی تھی اور پھر تمھیں اپنے پاؤں دھونے کا حکم دیا تھا۔ میں تم دونوں کو پاؤں دھوتے ہوئے غور سے دیکھتا رہا ہوں۔ سلیمہ نے ایک ہی لوٹے کے پانی سے اپنے دونوں پاؤں دھو لیے بلکہ اس کے بعد بھی اس کے لوٹے میں پانی بچ بھی رہا جب کہ تم نے ایک لوٹے کا سارا پانی ایک ہی پاؤں دھونے پر خرچ کر دیا۔ اس سے تمھاری عادت کا پتا چلتا ہے۔ جب تم پانی کے معاملے میں اس قدر فضول خرچ ہو تو گھی بھی اس طرح فضول خرچی سے اڑاتی ہو گی۔ ایسی صورت میں تمھارے پاس پانچ کی جگہ دس بھینسیں بھی ہوں تو بھی تمھارا ہاتھ تنگ رہے گا اور تمھیں اُدھار لینے کی ضرورت پڑتی رہے گی۔ قیامت کے روز تو انسان کے ہاتھ پاؤں اس کے خلاف گواہی دیں گے ہی، لیکن تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس دُنیا میں بھی انسان کے ہاتھ پاؤں اس کے خلاف گواہی دے سکتے ہیں۔''

قاضی کے اس فیصلے پر نجمہ کو سر جھکانا پڑا اور اس نے پانچ سیر گھی کی قیمت سلیمہ کو ادا کر دی۔ شہر کے لوگ جو اس عجیب اور دل چسپ مقدمے کا فیصلہ سننے کے لیے جمع تھے، قاضی کی دانائی پر اش اش کر اٹھے کہ اُس نے کیسی عقل مندی سے انصاف اور سچائی کا بول بالا کیا۔

سیاہ ٹوپی والا

عبدالرشید فاروقی

انہوں نے پلٹ کر چرواہے کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دوبارہ اس کے پاس آ گئے اور سرد آواز میں بولے:

''ہاں تو وہ سیاہ ٹوپی والا آدمی کہاں چھپا ہوا ہے؟''

چرواہا گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''نوجوان! میرا تعلق پولیس سے ہے، آپ کو کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''صاحب! میں کہہ چکا ہوں، میں نے کسی سیاہ ٹوپی والے کو یہاں نہیں دیکھا۔''

''مانتا ہوں، آپ اچھی اداکاری کر رہے ہیں لیکن شاید آپ نہیں جانتے، اس وقت آپ کس سے بات کر رہے ہیں۔ میرا نام انسپکٹر خان ہے اور مجھ سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں، آپ نے اس سیاہ ٹوپی والے کو دیکھا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''جی بالکل! آپ سو فی صد غلط کہہ رہے ہیں۔ میں نے یہاں کسی کو نہیں دیکھا۔'' چرواہے نے اعتماد سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، لیکن جب میں یہاں سے آگے جانے لگا تو آپ مسکرائے کیوں تھے؟'' انسپکٹر خان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

''اس کا یہ مطلب تو نہیں، میں نے اس سیاہ ٹوپی والے کو چھپایا ہے۔'' چرواہے نے جھنجلا کر کہا۔

اس کی بات سن کر انسپکٹر خان خاموش ہوگئے۔ وہ برابر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ چرواہے کی آنکھوں میں اب الجھن کے آثار نمایاں نظر آنے لگے تھے۔ وہ سامنے کھیت میں موجود اپنی بھیڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ انسپکٹر خان اس کے دائیں طرف موجود تھے۔ اچانک وہ مسکرائے اور دھیرے سے بولے:

''وہ سیاہ ٹوپی والا ایک مجرم ہے، ایک بس لوٹ کر بھاگا ہے۔ اسے پکڑوانے میں آپ میری مدد کریں، میں حکومت سے آپ کو انعام دلوانے کی کوشش کروں گا۔''

انسپکٹر خان کی بات سن کر چرواہے نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات تھوڑی دیر کے لیے تبدیل ہوئے مگر پھر فوراً وہ نارمل ہوگیا۔

''انسپکٹر صاحب! میں سچ کہتا ہوں، میں نے کسی سیاہ ٹوپی والے کو یہاں نہیں دیکھا۔ دیکھا ہوتا تو ضرور اس کے متعلق آپ کو آگاہ کر دیتا۔ میں پڑھا لکھا ہوں، جانتا ہوں، پولیس کی مدد کرنا میرا فرض ہے، لیکن میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے اُسے نہیں دیکھا۔''

چرواہا کہتا چلا گیا۔

''میرا خیال ہے، آپ کو پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔'' انہوں نے آہستہ سے کہا۔

چرواہے نے چونک کر ان کی طرف دیکھا:

''انسپکٹر صاحب! ایک ہفتے بعد میری بہن کی شادی ہے۔ مجھے پیسوں کی کیسے ضرورت نہیں ہوسکتی!''

''آپ کے والد صاحب کہاں ہیں؟'' انہوں نے اچانک پوچھا۔

''کیا مطلب!!!'' چرواہا یوں اُچھلا، جیسے اُسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں زمانے بھر کی حیرت اور خوف در آیا۔

''میں نے پوچھا ہے، آپ کے والد صاحب کہاں ہیں؟''

''وہ...وہ...وہ ایک کام سے شہر گئے ہیں۔ بہن کی شادی ہے نا، کچھ سامان وغیرہ خریدنے گئے ہیں۔''

''ان کا نام کیا ہے؟''

''نام..ہاں، ان کا نام ارسلان حمیدی ہے۔'' چرواہے پر گھبراہٹ پوری طرح حاوی تھی۔

''کیا میں آپ کے پاس بیٹھ سکتا ہوں؟''

''کک... کیوں، آپ میرے پاس کیوں بیٹھیں گے۔'' چرواہا اُچھل کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''میں آپ کے والد صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن...وہ آپ کا سیاہ ٹوپی والا...'' چرواہے نے کہنا چاہا۔

''اسے پھر پکڑ لوں گا۔''

''کیا وہ بھاگ نہیں جائے گا۔'' چرواہے نے جلدی سے کہا۔

''جی نہیں، وہ کہیں نہیں جاسکتا۔'' وہ مسکرائے۔

نوجوان چرواہے نے مزید کوئی بات نہ کی۔ انسپکٹر خان اس کے قریب بیٹھ گئے اور کھیت میں چرتی اس کی بھیڑوں کو دیکھنے لگے۔

''اچھا، یہ تو بتائیں، وہ آئیں گے کس وقت۔'' انسپکٹر خان نے اچانک گردن گھما کر چرواہے کی طرف دیکھا۔ اسے ایک طرف متوجہ دیکھ کر وہ مسکرائے۔ پھر انہوں نے اس کا کندھا پکڑ کر ہلایا:

''میں نے پوچھا ہے، آپ کے والد صاحب کب آئیں گے؟''

''جی وہ... معلوم نہیں، وہ کہہ کر گئے تھے کہ انہیں زیادہ دیر بھی ہوسکتی ہے۔ ان کا انتظار نہ کیا جائے۔'' چرواہے نے چونک کر کہا۔ اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوگیا۔

''نوجوان! جھوٹ بولنا بہت آسان ہے لیکن ان لوگوں کے لیے جن کا کام یہی ہوتا ہے۔ آپ جیسے لوگ جھوٹ نہیں بول سکتے۔ آپ نے اپنے والد صاحب کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن افسوس، آپ اس میں کامیاب نہیں ہوسکے۔'' انسپکٹر خان نے اُٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

''کک... کک... کیا مطلب!!!'' چرواہا حیرت سے اُچھل پڑا۔

''مم... میرا مطلب ہے، آپ اس سیاہ ٹوپی والے کو بچا نہیں سکے۔ میں نے جان لیا ہے، وہ کہاں چھپا ہوا ہے۔'' انہوں نے اس کے انداز میں کہا۔

''نہیں... یہ نہیں ہوسکتا۔ یہ نہیں ہونا چاہیے... اُف میری...'' چرواہے کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔

انسپکٹر خان نے گردن گھما کر اپنے عقب میں موجود ٹیلے کی طرف دیکھا اور نارمل آواز میں بولے:

''رحیم داد! آجاؤ۔''

فوراً ہی ٹیلے کی اوٹ سے نکل کر، دو سپاہی ان کے پاس آگئے۔ چرواہا انہیں دیکھ کر بہت زور سے اُچھلا۔ اس کے منہ سے نکلا:

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ ہے نوجوان چرواہے، میں نے اس سیاہ ٹوپی والے کو تلاش کر لیا ہے۔''

''کہاں ہے وہ؟'' چرواہے نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

''آپ کی بھیڑوں کے پیچھے۔ میرا مطلب ہے، ان کے پیچھے ایک گڑھے میں۔'' انسپکٹر خان نے مسکرا کر کہا۔

''اوہ...'' چرواہے کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا اور پھر وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

''نوجوان! اپنے والد صاحب سے کہو، رضا کارانہ طور پر خود کو

میرے حوالے کر دیں۔ اگر انہوں نے ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو آپ کو یا انہیں کوئی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ آپ لوگ اس پوزیشن میں نہیں ہیں... اس لیے کہ آپ کی بہن کی شادی میں ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔'' انسپکٹر کہتے چلے گئے۔

''ابا جان! آ جائیں... اب چھپنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ شاید اللہ کو یہی منظور ہے۔'' اچانک چرواہے نے چلا کر کہا۔ انسپکٹر خان نے دیکھا، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ چند لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ سیاہ ٹوپی والا گڑھے سے باہر نہ نکلا۔ یہ دیکھ کر چرواہے نے پھر کہا:

''ابا جان! باہر آ جائیں، ان لوگوں کو آپ کے بارے میں سب معلوم ہوگیا ہے۔''

اور پھر گڑھے میں سے ایک آدمی برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ چلتا ہوا ان کے پاس آ گیا۔

''لائیں، یہ پستول مجھے دے دیں... یہ آپ کے ہاتھ میں اچھا نہیں لگتا۔ یوں بھی آپ اسے چلانا نہیں جانتے اور نہ شاید یہ آپ کا اپنا ہے، ورنہ اب تک دو چار فائر ضرور کر چکے ہوتے۔'' انسپکٹر خان نے کہا اور اس پستول اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

سیاہ ٹوپی والے کی آنکھوں میں آنسو تھے، سر جھکا ہوا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا:

''انسپکٹر صاحب! میں یہ سب کرنا نہیں چاہتا تھا... لیکن۔''

''لیکن حالات انسان کو مجبور کر دیتے ہیں۔'' انسپکٹر خان نے کہا۔

''انسپکٹر صاحب! میری بہن...'' چرواہے نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''آپ فکر نہ کریں...'' انسپکٹر خان نے کہا۔ وہ سیاہ ٹوپی والے کی طرف متوجہ ہوئے:

''بے شک آپ مجبور تھے لیکن آپ نے راستہ غلط چنا، اس کی سزا تو آپ کو ملے لیکن میں وعدہ کرتا ہوں، آپ کی بیٹی کی شادی ضرور ہوگی اور اچھے طریقے سے ہوگی... ان شاء اللہ۔''

انہوں نے رحیم داد کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر سیاہ ٹوپی والے کو گرفتار کر لیا۔ پھر وہ اسے لے کر شہر کی طرف روانہ ہوگئے۔ راستے میں انسپکٹر خان اپنے ماتحت رحیم داد سے کہہ رہے تھے:

''رحیم داد! انسان پر مشکل وقت آتا ہے لیکن اسے غلط راستوں پر نہیں چلنا چاہیے۔ مشکل وقت آدمی پر اس کے مالک کی طرف سے امتحان ہوتا ہے۔ اچھے اور سچے مسلمان امتحان میں ضرور کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ ارسلان حمیدی پر بھی مشکل وقت آیا، لیکن اِس نے غلط راستے کا انتخاب کیا۔ اِس نے بہت سے لوگوں کو تکلیف دے کر اپنا مسئلہ حل کرنا چاہا لیکن چوں کہ یہ عادی مجرم نہیں ہے، اس لیے اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔''

رحیم داد اور اس کا ساتھی ان کی تائید میں سر ہلانے لگے جب کہ ارسلان حمیدی کا جھکا سر مزید جھکتا چلا گیا۔

ننھا مالی

سلمیٰ فاروق

''اِدھر میری بیماری جان نہیں چھوڑ رہی اور اب تم بھی زخمی ہو کر آ گئے ہو، اب کیا ہوگا؟'' چھوٹے سے صحن میں چارپائی پر لیٹے تنویر نے جب ہائے کی آواز نکالی تو فریدہ کچھ بے زاری سی بولی۔ وہ بھی کمرے میں سر باندھے لیٹی ہوئی تھی۔ وہ کئی دنوں سے بیمار تھی اور گھر میں اتنے پیسے نہ تھے کہ اس کا مکمل علاج ہو پاتا۔ بیماری نے اُسے کافی چڑچڑا بنا دیا تھا۔

''یہ چوٹ میں نے جان بوجھ کر تو نہیں لگائی بس قسمت ہی خراب تھی۔'' تنویر اپنی ٹانگ دباتے بولا۔

وہ مالی تھا اور کچھ سالوں سے وہ ایک ہی جگہ کام کر رہا تھا۔ حویلی کے بڑے سے لان میں اس کا سارا دن گزر جاتا۔ کام زیادہ تھا تو ساتھ پیسے بھی اچھے مل جاتے تھے، لیکن پھر اچانک حویلی کے مالکان حویلی بیچ کر کہیں اور چلے گئے اور یوں اس کی اتنی اچھی ملازمت بھی چلی گئی۔ اب وہ روزانہ صبح گھر سے نکلتا اور ہر اس گھر میں دستک دیتا جہاں اُسے لان نظر آتا تھا۔

''کیا آپ کو مالی کی ضرورت ہے؟'' وہ پوچھتا جاتا۔ کہیں مستقل ملازمت تو اُسے ابھی ملی نہیں تھی البتہ کبھی روز اور کبھی ایک روز چھوڑ کر اسے کچھ نہ کچھ کام مل ہی جاتا تھا، جس سے دال روٹی تو چل ہی رہی تھی۔ کل شام جب کام نہ ملنے کی وجہ سے وہ پریشان حال واپس آ رہا تھا تو سامنے سے آتی تیز رفتار گاڑی سے بچنے کی کوشش میں اس کی سائیکل سڑک کنارے لگے درخت سے ٹکرا گئی اور گرنے سے اُس کی ٹانگ زخمی ہوگئی تھی۔

''تم کوئی اور کام کیوں نہیں کرتے اس کام میں تو زیادہ پیسے بھی نہیں ملتے، پکی نوکری تھی تو پھر بھی ٹھیک تھا۔'' فریدہ نے سر پر بندھے دوپٹے کو کستے ہوئے کہا۔

''کوئی اور کام کیسے کروں، یہ تو میرا خاندانی پیشہ ہے اور پھر مجھے کچھ اور آتا بھی کیا ہے۔'' تنویر بے بسی سے بولا۔

''ابا کو اتنی چوٹ لگی ہے اور اماں ان کو ڈانٹ رہی ہیں۔''

بارہ سالہ فیصل نے گیند اچھالتے ہوئے سوچا وہ گھر کے بیرونی دروازے کے پاس ہی کھیل رہا تھا اور گھر اتنا بڑا تو تھا نہیں کہ بیرونی دروازہ دُور ہوتا، فیصل تک تمام آوازیں آسانی سے پہنچ رہی تھیں۔

''لیکن اماں بے چاری بھی کیا کریں، کتنے دنوں سے اُن کی دوا بھی نہیں آئی، ابا جو تھوڑے سے پیسے لاتے ہیں اُن سے تو صرف کھانا ہی بنتا ہے اور اماں کو پتہ ہے مجھے بھوک بہت لگتی ہے اسی لیے تو وہ اپنی دوا نہیں منگواتیں۔''

اسے فوراً اماں کا خیال بھی آ گیا تھا۔

''ابا کا زخم اب پتہ نہیں اور نہ جانے کتنے دن بعد ٹھیک ہوگا، کل بھی کام نہیں ملا تھا اور آج بھی ابا گھر پر ہیں تو اب کیا ہوگا؟

اماں بھی اس لیے زیادہ پریشان ہیں۔'' اس نے گیند کو زیادہ تیزی سے اچھالنا شروع کر دیا تھا۔

''اماں بیمار، ابا زخمی لیکن میں تو ٹھیک ہوں، کیا میں کچھ کر سکتا ہوں؟'' وہ گہری سوچ میں گم تھا اور ہاتھ گیند پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔

''ابا جو کام کرتے ہیں وہ مجھے آتا تو ہے۔'' وہ اکثر باپ کے ساتھ جاتا رہتا تھا اور ان کی تھوڑی مدد بھی کرتا تھا۔

''پودے تراشنے والی قینچی بڑی اور بھاری تو ہے، لیکن میں کوشش کر کے اس کو چلا سکتا ہوں۔''

وہ گھر کے اندر آ گیا اور دیوار کے پاس کھڑی سائیکل کی طرف بڑھا جس پر کپڑے کا تھیلا لٹک رہا تھا۔ اس تھیلے میں اس کے باپ کے باغبانی کے اوزار تھے۔ اس نے سائیکل کا اسٹینڈ نیچے کیا اور اس کو لے کر باہر کی طرف بڑھا تو آواز سن کر تنویر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم کہاں سائیکل لیے جا رہے ہو؟ یہ پہلے ہی کچھ اچھی حالت میں نہیں ہے۔''

''ابا میں کام کرنے جا رہا ہوں آپ تو اب جا نہیں سکتے کھانے اور اماں کی دوا کے لیے اب مجھے ہی کوشش کرنا ہوگی۔'' چھوٹا سا فیصل مضبوط لہجے میں بولا تو ایک بار تو تنویر حیران سا اسے دیکھنے لگا پھر اسے گھر سے باہر نکلتے دیکھ کر فوراً بولا:

''تم کیسے کر سکو گے یہ کام، ابھی تم بہت چھوٹے ہو اور پھر تمہیں کوئی کام دے گا بھی نہیں۔''

فیصل باپ کی بات مکمل ہونے تک گھر سے نکل چکا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پاؤں جو ابھی پیڈل تک ٹھیک طرح سے پہنچتے بھی نہ تھے اس وقت بڑی تیزی سے حرکت کر رہے تھے، ابھی اسے زیادہ دن بھی تو نہ ہوئے تھے سائیکل چلانا سیکھے اور سائیکل تھی بھی بڑی، لیکن کام کرنے کا جوش و جذبہ اسے تیز سائیکل چلانے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ دو تین مرتبہ گرتے گرتے بچا۔ اس کا گھر کچی آبادی میں تھا اور مطلوبہ جگہ پہنچنے کے لیے اسے دو کلومیٹر سائیکل چلانا پڑی تھی۔ اب پھولی سانس کے ساتھ وہ ان بڑے بڑے گھروں میں جھانک کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کہاں دستک دینے پر اسے کام مل سکتا ہے۔

''کیا آپ نے اپنے لان کی صفائی کروانی ہے؟ کسی پودے یا بیل کی کٹائی یا پھر گھاس کی کٹائی کروانی ہے۔'' فیصل نے ایک گھر سے ابتداء کر ہی دی۔

''کام تو ہے لیکن اس وقت صاحب گھر پر نہیں اور ان سے پوچھے بغیر تو میں ایسا نہیں کر سکتا۔'' دروازہ کھولنے والا ملازم تھا۔ ''ویسے کام کرنا کس نے ہے تمہارے ساتھ تو کوئی نظر نہیں آ رہا۔'' ملازم نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں خود کام کروں گا، کام مجھے آتا ہے۔'' فیصل جلدی سے بولا۔

وہ فیصل کی بات سن کر ہنسا اور پھر کچھ کہے بغیر دروازہ بند کر کے اندر چلا گیا۔

''میں چھوٹا ہوں، لیکن میں یہ کام تو کر سکتا ہوں۔'' وہ بلند آواز سے بولا تھا تاکہ آواز اندر تک جائے۔ پھر اس نے تھیلے سے قینچی نکالی اور باہر لگی باڑ کو تھوڑا سا کاٹا۔ قینچی بڑی اور اس کے ہاتھ چھوٹے تھے۔ اسے کافی مشکل ہوئی، لیکن ٹہنی کٹ ہی گئی۔

''دیکھو میں یہ کام کر سکتا ہوں۔'' وہ پھر چیخ کر بولا اور کچھ دیر انتظار کیا کہ شاید دروازہ کھل جائے۔

''ابھی تو بہت سے گھر ہیں مجھے یہیں نہیں رک جانا چاہیے۔'' وہ خود کو سمجھاتا آگے بڑھا۔ اگلے گھر پر کافی دیر دستک دینے کے بعد ایک لڑکی نے دروازہ کھولا۔

''کیا آپ کے لان میں کوئی کام ہے؟''

''نہیں'' یہ کہہ کر اُس نے دروازہ بند کر لیا۔

''ابھی اور بھی گھر ہیں۔'' وہ آگے بڑھا۔

''چھوٹے لڑکے کیوں میرا دروازہ توڑ رہے ہو؟''

فیصل نے جیسے ہی دستک دی تو دروازہ فوراً کھلا۔ بڑی عمر کا شخص شاید پاس ہی کھڑا تھا۔

''اگر آپ نے کسی بیل یا پودے کی کٹائی کروانی ہے تو میں ایسا کر سکتا ہوں۔'' فیصل نہایت ادب سے بولا۔

''اوہ!'' اس شخص نے غور سے فیصل کو پھر اس کی سائیکل اور سائیکل پر لٹکے تھیلے کو دیکھا۔
''تو تم باغبانی کا کام کرتے ہو! ویسے اتنا چھوٹا مالی میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔'' وہ ہنسا۔
''ہاں میں چھوٹا تو ہوں، لیکن مجھے سارا کام آتا ہے، یہ کام میں نے اپنے ابو سے سیکھا ہے۔'' فیصل پُرعزم لہجے میں بولا۔
''اچھا! تمہارا ابو خود کہاں ہے اور اس نے کچھ زیادہ جلدی نہیں کر دی تمہیں کام پر بھیجنے میں، لڑکے یہ عمر تمہاری سکول جانے کی ہے۔'' بڑے میاں بولے۔
ابو زخمی ہیں اس لیے وہ ابھی کام نہیں کر سکتے، امی بیمار ہیں، گھر میں صرف میں ہی ٹھیک تھا تو اب مجھے ہی کام کرنا چاہیے نا اور سکول کے بارے میں تو مجھے کچھ معلوم نہیں شاید اس کے لیے زیادہ پیسوں کی ضرورت ہوتی ہوگی۔''
''لڑکے تم باتیں بہت کرتے ہو، لیکن تم کام نہیں کر سکتے۔'' بڑے میاں کچھ لاجواب سے ہو کر اندر جانے کو مڑے۔
''میں کام کر سکتا ہوں آپ پہلے دیکھیں تو۔'' فیصل جلدی سے بولا۔
''نہیں میں نے اپنا پیارا لان خراب نہیں کرانا۔'' بڑے میاں واپس مڑے اور لگے فیصل کو ڈانٹنے۔ فیصل کو لگا اگر وہ کچھ دیر اور وہاں کھڑا رہا تو وہ اسے تھپڑ بھی لگا دیں گے۔ پھر اس نے سائیکل آگے بڑھا دی۔
''جب میں خود کام کرنا چاہتا ہوں تو ان لوگوں کو اس پر اعتراض کیوں ہے اور یہ میرا کام دیکھے بغیر کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں کام نہیں کر سکتا۔'' چھوٹا سا لڑکا بڑی سوچ لیے سائیکل کو تھامے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی ہمت ختم سی ہوتی جا رہی تھی۔
''اگر ابا میرے ساتھ ہوں تو پھر تو یہ لوگ کام مجھے دے دیں گے پھر میں ابا کو آرام سے ایک طرف بٹھا کر خود کام کروں گا۔'' اچانک اسے یہ خیال آیا۔ ''مجھے ابا کو ساتھ لانا ہوگا۔'' یہ سوچ کر اس نے سائیکل گھر کی طرف بڑھا دی۔
''میں نے کہا تھا نا تمہیں کوئی کام نہ دے گا۔'' تنویر نے اسے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر کہا۔
''لیکن ابا اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو پھر مجھے کام مل جائے گا، کئی گھروں میں کام ہے، لیکن وہ مجھے چھوٹا سمجھ کر کام نہیں دیتے بس آپ مجھے کام لے دیں پھر آپ آرام سے ایک طرف بیٹھ جائیے گا میں سب کام کر لوں گا۔''
''آج میرے لیے سائیکل چلانا مشکل ہے ہم کل چلیں گے۔''
''سائیکل تو میں چلاؤں گا ابا آپ کو پیچھے بٹھا کر۔'' فیصل جلدی سے بولا تو تنویر کو بیٹے پر بہت پیار آیا۔
''نہیں بیٹا مجھے بٹھا کر تمہارے لیے سائیکل چلانا بہت مشکل ہوگا۔''
''ابا آپ بھی دُوسروں کی طرح دیکھے بغیر ہی کہہ رہے ہیں کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔'' فیصل بولا۔
پھر کچھ دیر تو تنویر اسے سمجھاتا رہا کہ آج کے لیے تو راشن ہے کل چلیں گے کام پر، لیکن فیصل کو تو جنون سا ہو گیا تھا آج ہی کچھ کر کے دکھانے کا۔
''اماں کی دوا بھی تو لینی ہے دیکھیں ابھی تک وہ اندر سر باندھے لیٹی ہیں۔'' یوں کچھ دیر بعد فیصل نے باپ کو پیچھے بٹھا کر اپنا پورا زور لگائے سائیکل کو آہستہ آہستہ چلانا شروع کیا۔ تنویر نے پہلے کوشش تو کی تھی خود سائیکل چلانے کی، لیکن زخم پیر سے تھوڑا اُوپر لگا تھا اور پیڈل گھماتے ہوئے اس میں کافی تکلیف ہوتی تھی۔
''بیٹا! کیوں نا ہم کچھ دیر رک جائیں، تم تھک گئے ہو گے۔'' آدھا راستہ طے کرنے کے بعد تنویر نے کہا۔
''نہیں ابا! میں ٹھیک ہوں۔'' فیصل بولا۔
پھر باقی کا راستہ طے کرنے کے بعد بھی وہ ٹھیک رہا۔ اس کے اندر کا جوش کچھ کر دکھانے کا جذبہ اسے تھکنے ہی نہ دے رہا تھا۔
''ابا! دیکھا ہم پہنچ بھی گئے، میں نے کہا تھا نا کہ میں یہ کر سکتا ہوں۔'' فیصل کی آواز قدرے اُونچی اور خوشی سے بھرپور تھی۔
''ہاں میرے پیارے بیٹے! تم نے بہت مشکل کام کر دکھایا، تم واقعی بہت ہمت والے ہو۔'' پیچھے بیٹھے تنویر نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

''ابا! ہم اس کوٹھی میں نہیں جائیں گے یہاں ہمت توڑنے والے لوگ رہتے ہیں۔'' وہ وہاں سے گزر رہے تھے جہاں صبح فیصل کو انکار ہوا تھا۔ آج اس کی ہر بات تنویر کو حیران کر رہی تھی۔ پھر تنویر نے اسے وہ گھر دکھایا جہاں سے کام ملنے کی اُمید تھی۔ وہ اس علاقے میں آتا رہتا تھا اور اسے اندازہ ہوتا تھا کس دن کہاں سے کام مل سکتا ہے۔

''ان گلاب کے پودوں میں سے کچھ خراب جنگلی شاخیں نکل رہی ہیں ان کو کاٹ دینا اور ان کیاریوں سے جڑی بوٹیاں نکال کر صفائی کر دینا۔'' گھر کا مالک ان کو ہدایت دے کر چلا گیا۔

''ابا آپ بیٹھ جائیں میں یہ کام کرلوں گا، یہ تو بالکل بھی مشکل کام نہیں۔'' تھیلے سے قینچی نکالے فیصل پودوں کی طرف بڑھا۔

''تم اتنی ہمت دکھا رہے ہو تو تمہارا باپ اس زخم سے ہار جائے، ایسا نہیں ہوگا، لاؤ قینچی مجھے دو، میں شاخیں کاٹتا ہوں اور تم کیاریوں کی صفائی کرو۔'' تنویر کو کھڑے ہونے سے درد تو ہو رہا تھا، لیکن بیٹے کا احساس تھا کہ کہیں وہ اپنا ہاتھ نہ زخمی کر لے۔

''لیکن ابا جان آپ کو کھڑے ہونے سے تکلیف ہوگی، آپ کو تو میں صرف کام حاصل کرنے کے لیے لایا تھا۔'' وہ شاخ کاٹنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

نہیں گرم تیل لگانے سے مجھے اب کافی آرام ہے۔'' تنویر نے اس سے قینچی لے لی اور وہ گھر یہ لیے لگا کیاریاں صاف کرنے۔ فیصل کا کام کرنے کا جوش اور محنت دیکھ کر تنویر کو اپنا زخم بھولتا چلا جا رہا تھا۔

''واہ بھئی تم تو بہت اچھا کام کرتے ہو میرے لان کی کیاریوں کو تو تم نے بہت خوب صورت بنا دیا ہے۔'' وہ شخص کام کا جائزہ لینے آیا تو فیصل کو انتہائی انہماک سے کام کرتے دیکھ کر اسے بہت اچھا لگا اتنا اچھا کہ کام ختم ہونے کے بعد اجرت کے علاوہ اس نے اُسے انعام کے طور پر بھی کچھ پیسے دیئے۔

''ابا! ان پیسوں سے اماں کی دوا لیں گے۔'' وہ اپنی پہلی کمائی ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تھا۔ خوشی سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

''دیکھا بیٹا جہاں ہمت توڑنے والے لوگ ہیں وہاں ہمت بڑھانے والوں کی بھی کمی نہیں، ان صاحب کو تمہارا کام بہت پسند آیا ہے۔'' تنویر بھی بہت خوش تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے تو فیصل کو ایک عام کھیلنے کودنے والے بچے کی نظر سے ہی دیکھا تھا۔ وہ بے خبر تھا اس کی صلاحیت سے۔ وہ دُوسروں کے گھروں میں پھول لگاتا تھا اور قدرت نے اس کو بڑے خاص پھول سے نوازا تھا۔ اُس دن کے بعد فیصل صبح کے وقت اپنے ابو کے ساتھ کام کرتا اور شام کو پڑھنے کے لیے قریبی ٹیوشن سنٹر جانے لگا۔

☆☆☆

ظہورالدین بٹ

سچی کہانی

شہید مرتے نہیں

۱۸/ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شام پانچ بجے کی بات ہے۔ پاکستانی اور بھارتی کمانڈروں کی ایک اجلاس میں ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کے دوران بھارتی کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل سریش پوری نے لانس نائیک محمد محفوظ شہید کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''اس نوجوان نے جس بہادری کا مظاہرہ کیا ہے، اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس نے زخموں سے چور ہونے کے باوجود دشمن کے گنر کو گردن سے دبوچ کر ہلاک کر دیا۔'' اس نے محمد محفوظ شہید کے لیے سب سے بڑے فوجی اعزاز کی سفارش بھی کی۔

دشمن کی طرف سے محمد محفوظ شہید کے لیے خراج تحسین بڑے اعزاز کی بات تھی۔ اجلاس میں موجود ہر پاکستانی کا سینہ یہ بات سن کر فخر سے تن گیا۔

آنریری کیپٹن فلک شیر فوجی مجاہدین کی تربیت پر معمور تھے۔ انہیں فون پر محمد محفوظ کی شہادت کے بارے میں مطلع کیا گیا تو وہ سکتے میں آ گئے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب میں سنبھلا تو یوں لگا جیسے میرے دماغ کے پردے پر فلم چل رہی ہے۔ محمد محفوظ شہید اس میں سے نکل کر مسکرا کر کہتے ہیں۔

''کیوں استاد جی! اساں کہیا سی ناں کہ اسی تہانوں مایوس نہ کراں گے۔''

(کیوں استاد جی! ہم نے آپ سے کہا تھا ناں کہ ہم آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔)

پل کنجری میں پاک بھارت جنگ ۱۹۷۱ء کے دوران جامِ شہادت نوش کرنے والوں کی تعداد ۱۶ تھی۔ ان میں لانس نائیک محمد محفوظ کی لاش سب سے اگلے مورچے میں ملی۔ ان کے علاوہ محمد شفیع اور سپاہی ثناء اللہ کی لاشیں بھی دشمن کے مورچوں سے ملیں۔ جب محمد محفوظ کی لاش اُن کے گھر پہنچائی گئی تو اُن کی والدہ نے لالٹین کی روشنی میں گلی کا دروازہ کھلا تو انہوں نے بہت سے لوگوں کو گلی میں کھڑے پایا۔ یہ جنگ کے دن تھے اور ان کے دو بیٹے سرحدوں کی حفاظت کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ لوگوں کو دیکھ کر اُن کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ وہ ہمت کر کے آگے بڑھیں اور پوچھا: ''کون ہے؟''
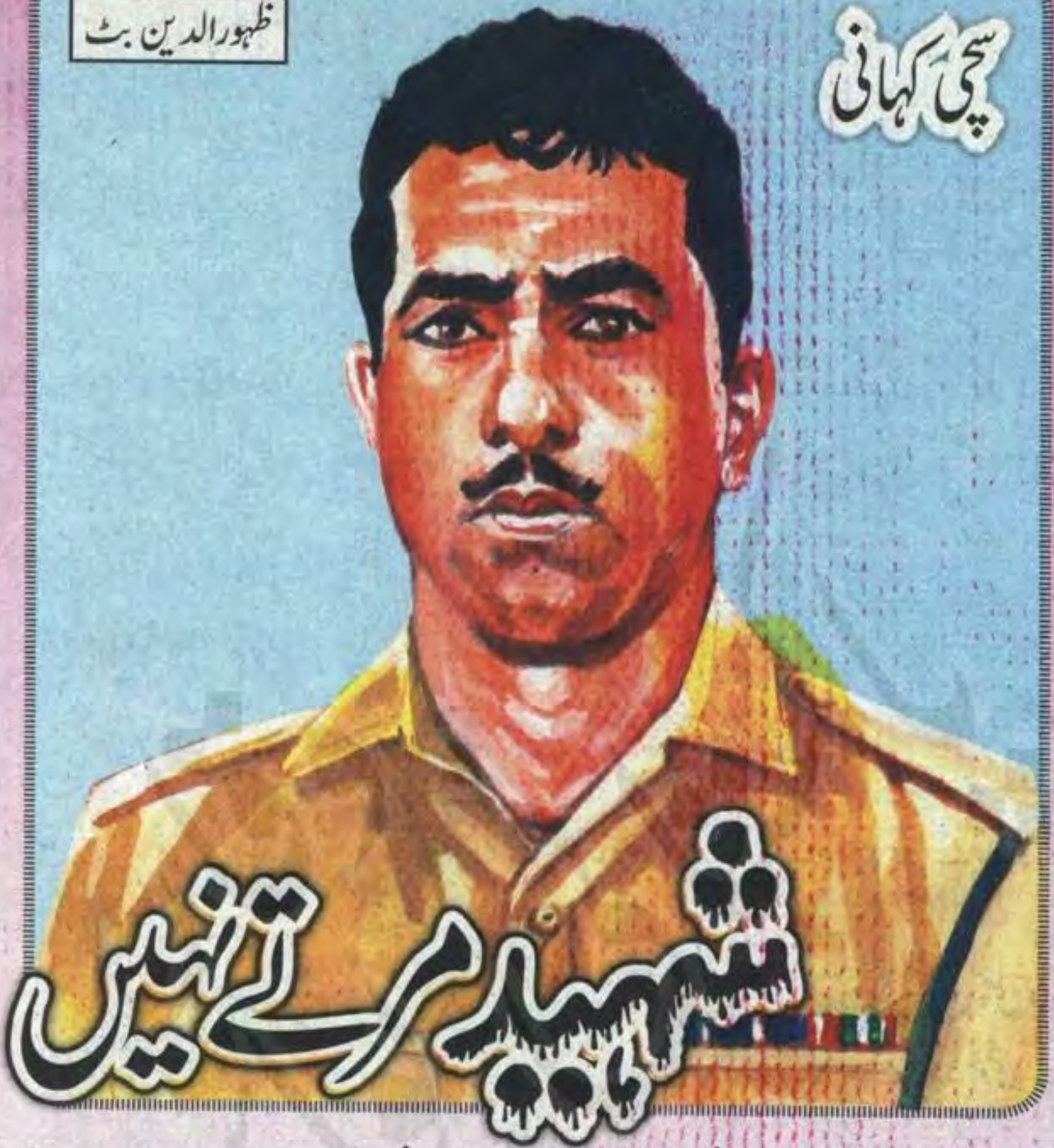
انہیں جواب ملا: ''ہم دو گھر سے آئے ہیں۔ آپ کا کوئی بیٹا فوج میں ہے۔''

محمد محفوظ کی والدہ سرور جان نے یہ سوال سن کر کہا: ''میرے دو بیٹے فوج میں ہیں۔''

ان کا یہ جواب سن کر انہیں بتایا گیا کہ لانس نائیک محمد محفوظ شہید ہو گئے ہیں۔ ہم ان کی لاش لے کر آئے ہیں۔ ماں آخر ماں ہوتی ہے۔ انہوں نے لالٹین زمین پر رکھ دی اور شہید کے تابوت سے لپٹ کر رونے لگیں۔ اتنے میں ان کی بہنیں بھی وہاں پہنچ گئیں۔

وہ روتے ہوئے کہنے لگیں: ''اُن کا فوجا جب بھی چھٹی پر آتا تھا تو اُن کے لیے تحفہ لے کر آتا مگر آج وہ اپنے خون کا نذرانہ لایا ہے۔''

بے شک یہ نذرانہ اُس کی اپنی ماں جائی بہنوں کے لیے ہی نہیں بلکہ وطن کی ساری بہنوں کے لیے تھا۔ اُس کا زخموں سے چھلنی بدن کٹی ہوئی ٹانگ اور تارتار وردی اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ جب تک ارضِ پاک میں محمد محفوظ جیسے غیرت مند اور بہادر بھائی موجود ہیں، ان کی بہنوں اور وطن کی سرحدوں کی جانب کوئی بُری نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔

لانس نائیک محمد محفوظ کے والد کو بیٹے کی شہادت کی اطلاع ملی تو بے اختیار اُن کی زبان سے انا للہ وانا الیہ راجعون نکلا۔ تابوت کو چھوتے ہوئے انہوں نے کہا:

''میرے بیٹے نے خاندان اور قوم کی لاج رکھ لی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اسے شہادت نصیب ہوئی۔''

سپاہی محمد الیاس لاش کے ساتھ آیا۔ اُس نے محمد محفوظ کی بہادری کے واقعات سناتے ہوئے اُن کی والدہ کو بتایا کہ شہید کو اپنی شہادت کا اتنا یقین تھا کہ انہوں نے جنگ سے پہلے ہی مجھے اپنے گھر کا پتہ لکھ کر دے دیا تھا کہ اُن کی لاش گھر پہنچانے میں کوئی دقت نہ ہو۔

لانس محمد نائیک محمد محفوظ کی نمازِ جنازہ میں شرکت کے لیے بے شمار لوگ اُن کے گاؤں پہنچے تھے۔ ۱۹/ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بعد از نمازِ ظہر ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی گئی اور انہیں ان کے آبائی گاؤں میں دفن کر دیا گیا۔ اُن کے بڑے بھائی محمد معروف اور بہنوئی سپاہی محمد فرید وقت پر نہ پہنچ سکے تھے۔

۱۵/ اپریل ۱۹۷۲ء کو انہیں پاکستان کا سب سے بڑا فوجی اعزاز نشانِ حیدر دیئے جانے کا سرکاری اعلان ہوا۔ ۱۶/ اپریل کو اس وقت کے چیف آف آرمی سٹاف جنرل ٹکا خان نے پنڈ ملکاں کا دورہ کیا۔ انہوں نے مزار پر پہنچ کر پھولوں کی چادر چڑھائی اور فاتحہ خوانی کی اور شہید کی گراں قدر خدمات پر انہیں خراجِ تحسین پیش کیا۔ وہ شہید کے والد راجہ مہربان خان سے بھی ملے۔ فوج

لانس نائیک محمد محفوظ کا شان دار مقبرہ تعمیر کرنا چاہتی تھی۔ ورثاء اس تجویز سے متفق تھے، لیکن تبدیلیٔ قبر کے باعث وہ کوئی فیصلہ نہ کر پا رہے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا چونکہ انہیں بطور امانت دفن نہیں کیا گیا تھا اس وجہ سے اُن کی قبر تبدیل نہ کی جائے۔ جب علماء کرام سے اس معاملہ پر رابطہ کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ شہید زندہ ہوتے ہیں اسی لیے دل میں کسی خوف یا وسوسے کو جگہ نہ دی جائے۔ تبدیلیٔ قبر کا اعلان کر دیا گیا۔ چھ ماہ ۱۳ دن کے بعد شہید کو نئی قبر میں دفن کرنے کے لیے اللہ اکبر اور اللہ ھو کے ورد کی صداؤں میں قبر کی کھدائی شروع کی گئی۔ وہ گرمیوں کا موسم تھا۔ اس موقع پر صدقہ و خیرات کا بندوبست بھی کیا گیا تھا۔ علاقہ کے معروف عالم مولانا حاجی میر علی قبر کشائی کے موقع پر وہاں موجود تھے۔ قبر کشائی کے موقع پر وہ قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ شہید کے بڑے بھائی محمد معروف قبر میں اترے۔ تابوت کو رسی کا سہارا دے کر اُوپر اٹھایا گیا۔ محمد معروف نے ہاتھ کا سہارا دے کر تابوت کو قبر سے نکالا۔

جب لانس محمد محفوظ شہید کی لاش قبر سے باہر نکالی جا رہی تھی تو لوگوں نے قدرت کا ایک عجیب وغریب نظارہ کیا۔ ان کے تابوت سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ چھ ماہ ۱۳ دن گزرنے کے باوجود یہ تازہ خون کے قطرے تھے۔ یہ دیکھ کر اُن کے گھر سے ایک پلیٹ منگوائی گئی۔ اُس پلیٹ میں خون کے یہ قطرے جمع کر لیے گئے۔ جب ان کی قبر کشائی کی جا رہی تھی تو دُور دُور تک فضا ایک تیز خوش بو سے معطر ہو گئی حالانکہ خدشہ تھا کہ اتنے عرصہ بعد لاش کو قبر سے نکالنے کی وجہ سے تعفن نہ پھیل جائے۔

یہ عقل کو حیران کر دینے والا عجیب وغریب واقعہ تھا۔ محمد محفوظ شہید کی لاش سے تازہ خون بہہ رہا تھا اور قبر سے خوش بو آ رہی تھی۔ محمد معروف ان کی شہادت کے وقت صوبہ سرحد میں خدمات انجام دے رہے تھے اس لیے وہ تدفین کے وقت بھائی کا چہرہ نہ دیکھ سکے تھے۔ اب انہوں نے شہید بھائی کا چہرہ دیکھنے کے لیے مولانا حاجی میر علی سے اجازت طلب کی۔

انہوں نے بسم اللہ پڑھ کر تابوت کا تھوڑا سا منہ کھولا تو وہاں

انہیں ایک انوکھا منظر نظر آیا۔ محمد محفوظ شہید جن کے چہرے پر دفن کرتے وقت ڈاڑھی نہ تھی، اب وہاں ڈاڑھی کے بال تین تین انچ بڑھے ہوئے تھے۔ ان کے زخموں سے تازہ خون بہہ رہا تھا۔ انہیں دفن کرنے سے پہلے پھولوں کی جو پتیاں ڈالی گئی تھیں وہ بھی بالکل تروتازہ تھیں۔ اُن کا چہرہ اگرچہ زخمی تھا، لیکن بالکل تروتازہ دکھائی دیتا تھا۔ اُن کے چہرے پر طمانیت اور بشاشت کے آثار نمایاں تھے۔ جس پلیٹ میں شہید کے جسم سے ٹپکتا ہوا تازہ تازہ خون جمع کیا گیا تھا، اُسے بھی شہید کے ساتھ اُن کی قبر میں دفن کر دیا گیا۔ اس موقع پر مولانا میر علی نے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ سنائی کہ شہید اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کرے گا کہ اُسے پھر زندہ کیا جائے پھر شہید کیا جائے۔ پھر زندہ کیا جائے اور پھر شہید کیا جائے۔

قبر کی تبدیلی کے موقع پر حاضرین یہ دیکھ کر بھی حیران ہو رہے تھے کہ چھ ماہ ۱۳ دن گزرنے کے باوجود محمد محفوظ کے تابوت کو دیمک لگی اور نہ ہی پھولوں کی مہک ختم ہوئی تھی۔ اس کی بجائے اس موقع پر ایسی تیز مسحور کن خوش بو سے فضا مہک اٹھی، جو انہوں نے اس سے پہلے کبھی نہ سونگھی تھی۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کہوٹہ جاتے ہوئے چکیاں سٹاپ سے گزرا کرتے تھے۔ انہوں نے عقیدت کے جذبے سے ایک بہت بڑا بورڈ وہاں نصب کرایا۔ یہ بورڈ لانس نائیک محمد محفوظ شہید (نشانِ حیدر) کے گاؤں کی نشان دہی کرتا ہے۔ اُن کی کوششوں سے دریائے سواں پر پیدل گزرنے والوں کے لیے پل تعمیر کیا گیا۔ یہ پل محمد محفوظ شہید کے نام سے منسوب ہے۔

لانس نائیک محمد محفوظ شہید کی خدمات کے اعتراف کے طور پر راول پنڈی میں اُن کے نام سے ایک سڑک منسوب کی گئی ہے۔ لاہور میں ہربنس پورہ کی بستی کو محفوظ پورہ کا نام دیا گیا ہے۔ پنجاب رجمنٹل سینٹر میں محمد محفوظ جس کمپنی میں تھے، اُس کا نام محمد محفوظ شہید رکھ دیا گیا۔ پنجاب کی الفا کمپنی کو محمد محفوظ شہید کمپنی کا نام دیا گیا۔ پنڈ ملکاں میں محمد محفوظ شہید کے مزار تک پختہ سڑک تعمیر کرائی گئی۔ بھمبر تراڑ سکول، جہاں محمد محفوظ شہید نے پرائمری تعلیم حاصل کی تھی اُسے ہائی سکول کا درجہ دیا گیا۔ اسی طرح پنجاب رجمنٹل سینٹر میں محمد محفوظ شہید کے نام سے ایک ہاسٹل بھی تعمیر کیا گیا ہے۔ اس ہاسٹل میں سکول میں زیر تعلیم بچے رہائش رکھتے ہیں۔

☆......☆......☆

شان دار دلیل

یہ پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے۔ انگریزوں نے حکم صادر کر دیا کہ 6 بجے کے بعد کوئی دُکان کھلی نہیں رہے گی۔ ایک دُکان دار کی گھڑی دس منٹ پیچھے تھی۔ جب چھ بج چکے تو پولیس نے دیکھا کہ اس کی دُکان ابھی بھی کھلی ہے تو وہ اسے پکڑ کر لے گئی۔ وہ شخص چلاتا رہا اور انہیں اپنی گھڑی پر وقت دکھاتا رہا مگر پولیس نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے عدالت میں پیش کر دیا۔ اس شخص کے گھر والوں نے ایک دیانت دار وکیل کی خدمات حاصل کیں۔ وہ وکیل پُر وقار انداز میں کورٹ میں داخل ہوا۔ اس شخص کا جرم بتایا گیا۔ وکیل نے جج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے دلائل دیئے۔

جج نے وکیل سے پوچھا: ''آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ شخص بے قصور ہے؟''

اس پر وکیل نے وہاں موجود چند لوگوں سے گھڑیاں لیں اور جج کے سامنے رکھ دیں اور جج سے سوال کیا۔

''مائی لارڈ! کیا ان گھڑیوں میں سے کوئی دو گھڑیوں کا وقت ایک جیسا ہے؟''

''نہیں۔'' جج نے جواب دیا۔

''اسی طرح کا واقعہ میرے موکل کے ساتھ ہوا ہے اور اس کی گھڑی بھی اسی طرح دس منٹ پیچھے تھی۔ چنانچہ میرا موکل بے قصور ہے لہٰذا اسے بری کیا جائے۔'' وکیل نے کہا۔

انگریز جج وکیل کی ذہانت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے فوراً اس شخص کو بری کر دیا۔

یہ ذہین وکیل ہمارے پیارے قائد اعظم محمد علی جناح تھے اور یہ واقعہ ان کی وکالت کے زمانے کا ہے۔

(انجم جعفری، لاہور)

ہونہار مصور

قائداعظم

زوہیب شہزاد، گوٹھ ماچھی (پہلا انعام: 175 روپے کی کتب)

چوہدری محمد حذیفہ گجر، سرگودھا (دُوسرا انعام: 150 روپے کی کتب)

اسامہ محمود، صادق آباد (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

علینہ شہزاد، ساہی وال (چوتھا انعام: 100 روپے کی کتب)

حریم قیصر، وزیر آباد (پانچواں انعام: 90 روپے کی کتب)

شہزادہ صغیر، شورکوٹ (چھٹا انعام: 75 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: محمد شہیر، اٹک۔ رابیل بلوچ، لاہور۔ مآب زینب، جہلم۔ زوہا فاطمہ، رابعہ تبسم، صادق آباد۔ جویریہ یونس، لاہور۔ ماہم نازش، اسلام آباد۔ امیمہ بابر، سیال کوٹ۔ نافعہ احسن، اٹک۔ زیب النساء، لاہور۔ شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور۔ محمد معیز احمد، فیصل آباد۔ فاطمہ رحیم، راول پنڈی۔ زاوش جدون، ایبٹ آباد۔ تحریم ثاقب، فیصل آباد۔ آمنہ سراج، اسلام آباد۔ عطا اللہ، ثناء اللہ، کوئٹہ۔ امین شاہ، پشاور۔ حمزہ مقصود، فہیم احمد، ساہی وال۔ اختر علی، قصور۔ چوہدری حمزہ اقبال، لاہور۔ ریحان الحق، فیاض الحق، کوٹ ادو۔ عظیم اقبال، کراچی۔ محی الدین بٹ، ملتان۔ عبداللہ، اسلام آباد۔ حسن مراد، ساہی وال۔ عبدالرحیم، لاہور۔ شایان علی، زعیم احمد، سیال کوٹ۔ محب اللہ، قصور۔ حمزہ خان، نوشہرہ۔ تمیم احمد، سیال کوٹ۔ منصب علی، لاہور۔ علی حسن، گجرات۔ ایمن علی، چیچہ وطنی۔ ایمان یوسف، ساہی وال۔ عبدالرحمٰن، عامر انور، لاہور۔

جنوری کا موضوع: برف باری کا موسم — آخری تاریخ 8 دسمبر

فروری کا موضوع: شہر کی تصویر — آخری تاریخ 8 جنوری

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی جب شہزادی عنبر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور اپنے خواب کے متعلق سوچنے لگی۔ اس کا پورا جسم پسینے سے شرابور تھا اور چہرے پر گہری پریشانی کے آثار تھے۔ اس نے آج پھر وہی خواب دیکھا تھا جو وہ گزشتہ تین دن سے دیکھ رہی تھی۔ خواب ڈراؤنا نہیں تھا، لیکن حیرت ناک ضرور تھا اور وہ اس کی تعبیر سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ تین دن سے ایک ہی خواب دیکھ رہی تھی کہ وہ تن تنہا ایک گھنے اور ویران جنگل میں کھڑی ہے اور اس کے اِرد گرد مکڑی کا جالا تنا ہوا ہے۔ وہ اس حصار سے باہر نکلنا چاہتی ہے، لیکن بے بس ہے۔ اور ایک بڑا سا خوں خوار مکڑا بڑی تیزی سے اس جال کو مزید گھنا کرتا جا رہا ہے۔

شہزادی عنبر نے اپنے بوڑھے اتالیق سے سن رکھا تھا کہ خوابوں کا تعلق دراصل انسان کے لاشعور سے ہوتا ہے۔ انسان دن بھر جو کچھ سوچتا ہے اُسی کا عکس اسے اپنے خوابوں میں دکھائی دیتا ہے، لیکن بعض خواب انسان کے لیے بشارت کا درجہ بھی رکھتے ہیں۔ یہ خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے انسان کو آنے والے حالات سے پیشگی آگاہ کرنے کے لیے دکھائے جاتے ہیں۔ اسی لیے وہ سوچ رہی تھی کہ بار بار ایک ہی طرح دکھائی دینے والا خواب محض اس کی سوچوں کا عکس ہے یا قدرت کی طرف سے کوئی بشارت......! اسی سوچ بچار میں صبح ہوگئی اور ایک خادمہ نے اطلاع دی کہ شہنشاہ حضور نے آپ کو اپنی خواب گاہ میں طلب کیا ہے اور حکم دیا ہے کہ آپ بلاتاخیر ان کی خدمت میں پیش ہو جائیں۔ حکم پاتے ہی شہزادی اٹھی اور ملاقات کی تیاری کرنے لگی۔ تاہم وہ سوچ رہی تھی کہ خدا خیر کرے اتنی صبح اچانک طلبی کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟

☆☆☆

شہزادی عنبر شاہ فارس کی اکلوتی اولاد تھی۔ اگرچہ کم سن تھی لیکن بہت ذہین، بہادر اور معاملہ فہم تھی۔ اسے بچپن ہی سے علم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ کتابیں پڑھنا اور مختلف علوم و فنون سیکھنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اس لیے کم عمری میں ہی اس نے تلوار بازی، گھڑ سواری اور تیراکی میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ بوڑھے اتالیق سے کتابیں پڑھنے اور فنونِ حرب سیکھنے کے علاوہ حکمت اور دانائی کی باتیں سیکھنا بھی اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنا وقت بے کار مشاغل میں ضائع نہیں کرتی تھی اور ہمہ وقت مفید باتیں سیکھنے کی جستجو میں رہتی تھی۔

اس کی انہیں خوبیوں کی بناء پر شاہ فارس اس سے بہت خوش تھا اور کم عمری میں ہی اس نے شہزادی عنبر کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ شہزادی عنبر کے ہوتے ہوئے بادشاہ کو بیٹے کی کمی کبھی محسوس

نہیں ہوئی تھی، لیکن گزشتہ چند سالوں سے وہ بہت بے چین تھا اور بڑی شدت سے اس مناسب وقت کا انتظار کررہا تھا کہ جب شہزادی امور مملکت چلانے کے قابل ہوجائے اور وہ اپنی زندگی میں ہی اس کی تاج پوشی کردے۔

شاہ فارس کی بے چینی کی وجہ اس کی وہ پُراسرار بیماری تھی جو بڑے بڑے حکیموں اور طبیبوں کی سمجھ سے بھی بالاتر تھی۔ اس بیماری کی وجہ سے وہ دن بہ دن بہت کمزور ہوتا جارہا تھا اور یہ پُراسرار بیماری اسے بہت تیزی سے بڑھاپے کی جانب دھکیل رہی تھی۔ بیماری اور بڑھاپے کی وجہ سے وہ حکومتی معاملات پر پوری طرح توجہ نہیں دے پارہا تھا اس لیے روز بروز اس کی حکومت پر گرفت کمزور ہوتی جارہی تھی۔ بادشاہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے وزیروں نے من مانیاں شروع کردیں تھیں۔ وہ اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے نااہل لوگوں کو حکومت کے افسر مقرر کرتے اور ان کے ذریعے عوام پر طرح طرح کے ظلم ڈھاتے۔ نت نئے بہانے ڈھونڈ کر عوام پر بھاری ٹیکس لگاتے، تاجروں سے بھتہ وصول کرتے اور کسانوں پر بھاری لگان عائد کرتے۔ جس کی وجہ سے عوام میں بے چینی اور بدامنی پھیلنا شروع ہوگئی تھی۔ ملک سے عدل و انصاف ختم ہوکر رہ گیا تھا۔ ہر طرف مہنگائی اور ناانصافی کا راج تھا۔ چالاک وزیروں نے بوڑھے بادشاہ کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا اور عوام کی حالت زار کی کوئی خبر اس تک نہ پہنچنے دیتے تھے۔ بلکہ اسے سب اچھا ہے کی رپورٹ دیتے تھے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ بادشاہ مرے اور وہ حکومت پر قبضہ جمالیں۔

وقت آہستہ آہستہ مٹھی کی ریت کی طرح پھسلتا جارہا تھا۔ ایک دن بوڑھے اتالیق نے شہنشاہ فارس سے ملاقات کی اور انہیں خوش خبری دی کہ شہزادی کی عمر نہ صرف سولہ برس ہونے والی ہے بلکہ اس نے اپنے زمانے کے تمام علوم اور فنونِ حرب میں مہارت بھی حاصل کرلی ہے۔ شہنشاہ چاہیں تو اس کی تاج پوشی کرسکتے ہیں۔ یہ خبر سن کر شاہ فارس بہت خوش ہوا اور اس نے اگلے ہی روز صبح سویرے شہزادی عنبر کو اپنی خواب گاہ میں طلب کرلیا۔ رسمی آداب کے بعد شہنشاہ فارس نے کہا:

''بیٹی! آپ جانتی ہیں کہ بیماری کے باعث ہم بہت بوڑھے اور کمزور ہوچکے ہیں۔ اور یہ سلطنت جو ہمارے بزرگوں نے بڑی قربانیاں دے کر حاصل کی تھی اس پر ہماری گرفت کمزور ہوتی جارہی ہے۔ ہم بڑی مدت سے اس انتظار میں تھے کہ کب آپ حکومت سنبھالنے کے قابل ہوں اور ہم آپ کی باقاعدہ تاج پوشی کرکے تخت و تاج آپ کے حوالے کردیں۔ اب وہ نیک ساعت آن پہنچی ہے۔ کیا آپ خود کو حکومت کی بھاری ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل پاتی ہیں؟''

شہزادی نے ساری باتیں سن کر نہایت ادب سے جواب دیا:

''بابا جان! آپ کی خواہش سر آنکھوں پر ہے۔ تاہم ایک شفیق باپ کی لاڈلی بیٹی ہونے کے ناطے ہم ایک رعایت اور کچھ مہلت کے طالب ہیں......!''

''کیسی رعایت اور کیسی مہلت؟'' شہنشاہ نے بے قرار ہوکر پوچھا۔

''ابا جان! ہم نے اپنے استاد محترم سے سیکھا ہے کہ اچھا بادشاہ وہی ہوتا ہے جسے نہ صرف اپنی عوام کے جذبات و احساسات کا پوری طرح ادراک ہو بلکہ وہ ان کے مسائل حل کرنے میں پوری طرح مستعد بھی ہو، لیکن بدقسمتی سے ہم محلوں میں رہنے والوں کا اپنی عوام کے بارے میں تمام تر معلومات کا انحصار افسران کی پیش کردہ رپورٹوں پر ہوتا ہے۔ اس رپورٹوں سے ہمیں ان کے مسائل کی خبر تو مل جاتی ہے لیکن ان کے احساسات کا صحیح ادراک نہیں ہوپاتا اور یہ تب ہی ممکن ہے جب ہم بھی ویسے ہی حالات سے گزریں جن سے ہماری عوام گزر رہی ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ تخت پر بیٹھنے سے پہلے ہم کچھ عرصہ ایک عام آدمی کی طرح اپنی عوام کے درمیان رہیں۔ ان کے دکھ درد کو سمجھیں اور ان کے مسائل کا حقیقی ادراک حاصل کریں۔''

شہنشاہ شہزادی کا جواب سن کر حیران رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نازونعم میں پلنے والی شہزادی ایک عام آدمی کی طرح رہنے کی خواہش بھی کرسکتی ہے۔ اس لیے اسے شہزادی کی خواہش پوری کرنے میں تامل ہوا۔

''ابا جان ہم عوام کے جسموں پر حکومت کرنے کی بجائے اُن کے دل جیتنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ طاقت اور تلوار سے کسی کو جسمانی طور پر تو فرمانبردار بنایا جاسکتا ہے لیکن اس کا دل فتح نہیں

کیا جاسکتا۔'' غرض کہ شہزادی نے شہنشاہ کو اپنی بات پر قائل کرلیا اور چند ہی دن بعد ایک رات نہایت راز داری کے ساتھ شہزادی محل سے رخصت ہوگئی۔

☆☆☆

شہزادی جب محل سے رخصت ہوئی تو وہ عام شہری کے لباس میں تھی۔ شہنشاہ نے دو انتہائی وفادار سپاہی بھی اُس کے ہمراہ بھیجے تھے۔ سب الگ الگ گھوڑوں پر سوار تھے۔ شہزادی نے اپنے قیام کے لیے دارالحکومت سے کافی دُور ایک شہر کا انتخاب کیا تھا۔ وہ تینوں سرپٹ گھوڑے دوڑاتے، منزلوں پر منزلیں مارتے اپنے منتخب شہر کے قریب ایک قصبے میں پہنچ گئے۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنے گھوڑے قصبے کی مویشی منڈی میں فروخت کیے اور بڑے شہر کی طرف چل پڑے۔ شہزادی نے اپنے محافظوں کو سمجھا دیا تھا کہ اب ہم آقا اور غلام نہیں بلکہ بہن بھائی ہیں۔ اور ہمارا تعلق شاہی خاندان سے نہیں بلکہ ایک عام گھرانے سے ہے۔ اور وہ ہر ممکن حد تک اپنی اصلیت چھپائے رکھیں گے۔

تین افراد کا یہ قافلہ شام ہونے سے قبل ہی شہر پہنچ گیا تھا اور اب نہیں رات بسر کرنے کے لیے ٹھکانے کی ضرورت تھی۔ شہر کے دروازے کے قریب ہی شہر کے کوتوال کا دفتر تھا۔ دفتر کے باہر ایک بڑھیا زاروقطار رو رہی تھی۔ شہزادی کو اس پر بڑا ترس آیا اور ہمدردی سے پوچھا: ''اماں جی آپ کیوں رو رہی ہیں ......؟''

بڑھیا نے روتے ہوئے بتایا:

''میں ایک بیوہ عورت ہوں۔ میرا ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے، میں فصیلِ شہر سے باہر ایک دیہاتی بستی میں رہتی ہوں۔ چند روز قبل ہمارے گاؤں میں ڈاکو آگئے تھے۔ وہ بے دردی سے لوگوں کا مال و اسباب لوٹ رہے تھے۔ میرے بیٹے سے یہ ظلم برداشت نہ ہوا اور وہ ڈاکوؤں سے بھڑ گیا۔ میرا بیٹا بہت بہادر ہے وہ بہت جی جان سے لڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے ڈاکوؤں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کی دلیری دیکھ کر باقی ڈاکو خوف زدہ ہوکر بھاگ گئے اور یوں لوگوں کا مال و اسباب لٹنے سے بچ گیا، لیکن کوتوال شہر نے میرے بیٹے کو شاباش اور سرکار سے انعام دلوانے کی بجائے الٹا گرفتار کرلیا ہے اور اس کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کرلیا ہے۔ اب اس کے کارندے کہتے ہیں کہ بیٹے کو چھڑوانا ہے تو پانچ سو سونے کے سکے لے آؤ، میں غریب بیوہ عورت پانچ سو سونے کے سکے کہاں سے لاؤں...... میں تو کیا پوری بستی کے لوگ مل کر بھی سونے کے پانچ سو سکے جمع نہیں کرسکتے...... ہائے میرا بیٹا، ظالموں نے اسے مار مار کر ادھ موا کردیا ہے......!'' بڑھیا اپنی بپتا سنا کر پھر سے زاروقطار رونے لگی۔

شہزادی کو کوتوال کے ظلم پر بڑا غصہ آیا اور حیرت بھی ہوئی کے ہمارے ملک میں ایسے واقعات بھی ہوتے ہیں اور ہمیں خبر ہی نہیں ہو پاتی۔ پھر کسی خیال کے تحت اُس نے بڑھیا سے پوچھا:

''آپ گاؤں والوں کے ساتھ مل کر حاکمِ شہر سے کوتوال کے خلاف فریاد کیوں نہیں کرتیں ......؟''

بڑھیا کے گرد چند اجنبی مسافروں کا جھمگٹا دیکھ کر آس پاس کے چند دُکان دار بھی وہاں آ گئے تھے۔ ایک دُکان دار بولا: ''بیٹی ہم حاکمِ شہر سے شکایت تو تب کریں گے جب اس سے مل پائیں گے۔ اس سے ملنے کے لیے اس کے دربانوں کا منہ سکوں سے بھرنا پڑتا ہے۔ پھر رسائی ہو بھی جائے تو حاکمِ شہر کوتوال کے خلاف شکایت سننا ہی گوارا نہیں کرتا۔ کیوں کہ اسی کی شہہ پر ہی تو شہریوں پر یہ ظلم ڈھایا جاتا ہے۔''

شہزادی پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کی مملکت میں عوام پر کیسے کیسے ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔ بہرحال اس نے اپنی حیرت اور غصے پر قابو پایا اور گھوڑوں کی فروخت سے حاصل ہونے والے سکوں کی تھیلیاں بڑھیا کو تھماتے ہوئے کہا: ''لیجئے اماں جی یہ سونے کے سکے اور لے جاکر کوتوال شہر کے منہ پر دے ماریئے اور اپنے بیٹے کو چھڑوا لیجئے......!''

شہزادی کی اس رحم دلی اور سخاوت پر سب لوگ بہت حیران بھی ہوئے اور خوش بھی ...... بڑھیا تو بہت ہی خوش تھی اس نے ممنون نظروں سے شہزادی کی طرف دیکھا، اُسے دل سے دُعائیں دیں اور خوشی خوشی کوتوال کے دفتر کی جانب بڑھ گئی۔ اور شہزادی بھی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سرائے کی تلاش میں آگے بڑھ گئی۔

سرائے کی تلاش کے دوران وہ مختلف بازاروں سے گزری۔

محل لوٹتے ہی شاہ فارس نے ایک باوقار تقریب میں شہزادی کی تاج پوشی کردی۔ حکومت سنبھالتے ہی شہزادی نے ان تمام وزیروں اور افسران کو گرفتار کرنے کا حکم دیا جن کی پشت پناہی کی وجہ سے عوام پر ظلم ڈھایا جارہا تھا۔ اگر یہ سلسلہ مزید کچھ عرصہ چلتا رہتا تو یقیناً تنگ آئی ہوئی عوام بغاوت پر اتر آتی یا پڑوسی ملکوں کو اپنے ملک پر قبضہ کرلینے کی دعوت دینے لگتی۔ اس کے علاوہ اس نے فوری اقدام کے طور پر کسانوں اور مزدوروں پر تمام ٹیکس معاف کردیے۔ کیوں کہ اپنے عوامی دورے کے دوران اس نے جان لیا تھا کہ کسی ملک کی اصل طاقت اس کے سپاہی نہیں بلکہ اس کے کسان اور مزدور ہوتے ہیں جو اپنا خون پسینہ بہا کر غلہ اگاتے اور صنعتیں چلاتے ہیں۔ انہی کی محنت سے حاصل ہونے والی پیداوار پر پورے ملک کی رعایا حتیٰ کہ فوجیوں اور امراء کا انحصار ہوتا ہے۔ اگر یہ لوگ خوش حال ہوں گے تو پورا ملک خوش حال ہوگا۔ تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہونے کے بعد چند دنوں کے اندر اندر شہزادی نے ایک نیا محکمہ قائم کیا جس میں ایسے ذہین افراد کو بھرتی کیا جو پورے ملک میں گھومتے پھرتے تھے اور اپنے مشاہدات اور عوام کی تکالیف کی براہ راست خبر شہزادی کو دیتے تھے۔

کہتے ہیں کہ شہزادی عنبر نے کافی عرصہ حکومت کی۔ اپنی حکومت کے دوران اس نے عوام کی خبر گیری، عدل و انصاف کی فراہمی اور روزگار کی فراہمی پر بھرپور توجہ دی یہی وجہ تھی کہ اس کی حکومت صرف ملک تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ اس نے تمام زندگی اپنے عوام کے دلوں پر راج کیا تھا۔ کیوں کہ اس نے یہ راز جان لیا تھا کہ عوام کی سب سے اہم ضرورت امن و امان اور خوش حالی ہے۔ اور خوش حالی کا راز روزگار کے یکساں مواقع فراہم کرنے میں اور امن و امان کا راز بلا امتیاز و تفریق عدل و انصاف فراہم کرنے میں ہے۔

☆☆☆

بازار میں اس نے کئی نوجوان مزدوروں کو بھی دیکھا جن کے چہروں سے حسرت ٹپک رہی تھی۔ ان ہی کے درمیان اسے کئی بوڑھے افراد بھی نظر آئے وہ اپنی پیٹھ پر بھاری بوجھ لادے چل رہے تھے۔ اس نے ان میں سے کچھ لوگوں کو روک کر ان کے حالات بھی دریافت کیے۔ مزدوروں کے چہروں اور باتوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اتنی محنت اور سخت مشقت کے باوجود انہیں دو وقت کا کھانا بھی ٹھیک طرح سے میسر نہیں ہے اور وہ نہایت غربت کی زندگی بسر کررہے ہیں۔

اگلے کئی دن تک شہزادی گاؤں گاؤں اور شہر شہر پھرتی رہی۔ اس دوران اس نے سینکڑوں مزدوروں، دُکان داروں اور کسانوں سے ملاقات کی۔ اور عوامی زندگی کا بغور مشاہدہ کیا تب اسے احساس ہوا کہ چند سو نااہل اور بے ایمان افراد کیسے لاکھوں افراد کا جینا دوبھر کردیتے ہیں اور تختِ شاہی پر بیٹھے فرد کی ذرا سی غفلت عوام کو کس قدر سخت مشکلات سے دوچار کردیتی ہے۔ تب وہ بہت سے عزم و ارادے لے کر محل لوٹ گئی۔ اب اسے اپنے عجیب و غریب خواب کی بھی سمجھ آگئی تھی۔ سرسبز و شاداب اور گھنا جنگل اس کا ملک تھا اور خونی مکڑے اس کے بے ایمان وزیر اور مکڑی کے جالے ان کے ظلم تھے جو فارس کی حکومت کو اندر ہی اندر گھن کی طرح چاٹ رہے تھے۔

ہمیں کھو نہ دینا

ڈاکٹر طارق ریاض

بچے خاصی دیر سے تالیاں بجا رہے تھے۔ کبھی کبھار ان کے قہقہے بھی بلند ہوتے۔ پھر کچھ دیر کے لیے خاموش ہو جاتی۔ یہ سلسلہ کچھ دیر چلتا رہا۔ جب کہ گھر کے بڑے ایک کمرے میں بیٹھے اپنی گفتگو میں محو تھے۔ ارشاد ماموں خاصے دنوں بعد آئے تھے۔ اسی لیے سبھی افراد خوش تھے۔ بچے اکٹھے ہو کر لان میں چلے گئے تھے۔ جہاں وہ اپنی دل چسپیوں میں مصروف تھے۔ ارشاد ماموں مقامی یونیورسٹی میں حیاتیات کے پروفیسر تھے۔ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ خاصا وسیع تھا۔ وہ بیٹھے بڑوں کے ساتھ تھے، لیکن ان کے کان باہر لگے ہوئے تھے۔

''ضرور بچے کچھ گڑبڑ کر رہے ہیں!'' اس بات پر اُن کا دھیان زیادہ تھا۔ آخر اُن سے نہ رہا گیا اور وہ اٹھ کر بالکونی میں آ کھڑے ہوئے جہاں سے پورا لان بڑا واضح دکھائی دے رہا تھا۔

گزشتہ روز کی بارش نے پورے ماحول کو دھو ڈالا تھا۔ فضا کا گرد و غبار اتر گیا تھا۔ نیلگوں آسمان بہت کھلا محسوس ہو رہا تھا۔ اکا دکا بادلوں کے ٹکڑے سفید آنچل کی مانند ہوا کے دوش پر تیر رہے تھے۔ پرندے چہچہا رہے تھے۔ درختوں کے پتے دھل کر ایسے لگ رہے تھے جیسے کسی نے ان کو غسل دے کر کھڑا کر دیا ہوں۔ ہوا میں نمی تھی جو تازگی کا احساس لیے ماحول کو خوش گوار بنائے ہوئے تھی۔ کیوں کہ بارش تھوڑی دیر پہلے ہوئی تھی۔ اسی لیے بہت سے حشرات بھی مٹی سے باہر آ گئے تھے۔ جب کہ متعدد حشرات فضا میں غوطہ زن تھے۔ ماموں جان نے کچھ لمحات تو فطرت کی رنگینی کا مزا لوٹا، مگر یہ دیکھ کر ان کو افسوس ہوا کہ بچے بڑا غلط کام کر رہے تھے۔ رمشاء، ایان اور علی مٹی میں سے نکلنے والے کیچوے (Earthworms) پکڑ پکڑ کر باہر نکال رہے تھے اور فرش پر رکھ کر اُن پر نمک دانی سے نمک چھڑک رہے تھے۔ کیچوے چونکہ اپنی جلد سے سانس لیتے تھے۔ چنانچہ نمک لگنے سے وہ تکلیف میں تھے۔ اسی وجہ سے وہ تڑپ رہے تھے۔ ان کو تڑپ تڑپ کر مرتا دیکھ کر بچے خوشی سے تالیاں بجانے لگتے۔ جب کوئی کیچوا مر جاتا تو خاموشی چھا جاتی اور پھر بچے لان میں جا کر کسی نئے کیچوے کو تلاش کرنے لگتے۔ ان میں سے ذیشان الگ تھا، لیکن اس کی حرکت بھی کچھ کم نہ تھی۔ اس نے ہاتھ میں دھاگے کی نلکی پکڑ رکھی تھی۔ وہ پتوں اور پھولوں پہ بیٹھنے والی تتلیوں کو پکڑتا اور ان کی دُم پہ دھاگہ باندھ کر انہیں فضا میں اڑنے پر مجبور کرتا۔ ماموں جان تو لوگوں کو جنگلی حیات کے تحفظ کا درس دیتے دیتے تھکتے نہ تھے۔ اپنے گھر کے بچوں کو یہ کچھ کرتا دیکھ کر ان کا پارہ چڑھ گیا۔ قریب تھا کہ وہ کسی بچے کی مرمت کر ڈالتے۔ یک دم انہیں خیال آیا کہ بچوں پر سختی کرنے کی بجائے پیار سے انہیں سمجھایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بچوں کو پیار سے مخاطب کیا۔ ماموں جان کی آواز پر سبھی ان کی طرف لپکے۔ کچھ دیر بعد تمام بچے ماموں جان کی عدالت میں کھڑے تھے۔

ذیشان کے ہاتھ میں ایک خوب صورت البم تھا۔ جس میں رنگ برنگی چھوٹی بڑی تتلیاں چسپاں تھیں۔ اللہ جانے وہ کب سے

ان بے گناہ تتلیوں کو ہلاک کر کے انہیں اپنی البم کی زینت بنا رہا تھا۔ ذیشان نے سب کو وہ البم دکھایا تو سبھی ششدر رہ گئے۔ خوب صورت مردہ تتلیاں دیکھ کر سب کو بہت افسوس ہوا۔ ماموں جان بھی افسردہ تھے۔ انہوں نے ساری زندگی اپنے طلبہ کو یہی درس دیا تھا کہ جنگلی حیات کی قدر کی جائے۔ انہیں بھی جینے کا حق دیا جائے۔ ماموں جان نے سب بچوں کو اپنے قریب کر لیا اور پوچھا:

''آپ نے تتلیاں کیوں ہلاک کیں؟ کیچوے پر نمک کیوں چھڑکا؟ اور تتلی کی دُم پر دھاگہ کیوں باندھا؟''

بچے ان سوالات کے جواب سوچنے لگے۔ وہ اب شرمندہ تھے کہ انہوں نے یہ حرکت کی، لیکن لفظ کیوں کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

''جانوروں پر رحم کرنے کا حکم ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کو ناپسند فرمایا ہے جو جانوروں کو تکلیف دیتے ہیں۔ سب جانور اللہ تعالیٰ نے کسی نہ کسی مقصد کے لیے پیدا کیے ہیں، تم لوگ تتلیوں اور کیچوؤں کی اہمیت سے آگاہ نہیں ہو۔'' ماموں جان نے بچوں کو مخاطب کیا۔

''ماموں جان! کیچوے کا ہمارے ماحول سے کیا لینا دینا۔ یہ تو مٹی میں چھپا رہتا ہے۔ مٹی کھاتا ہے اور مٹی نکالتا ہے۔'' رمشا کا سوال سن کر ماموں جان بولے:

''اچھی بچی! سنو! تم نے کبھی ہل یا ٹریکٹر دیکھا ہے؟''

سب بچے چلائے: ''ہم نے دیکھا ہے۔ یہ زمین کی کھدائی کرتا ہے۔''

''اچھا تو ہم زمین کی کھدائی کیوں کرتے ہیں؟'' اگلا سوال ہوا۔

اب ذیشان بولا: ''ماموں جی! تاکہ ہماری زمین نرم ہو جائے اس میں سے ہوا کا گزر ہو۔ پودوں کی جڑوں کو آکسیجن دستیاب ہو! وہ اچھی نشوونما کریں۔ پیداوار زیادہ ہو!''

''واہ جی واہ! ذیشان تو بڑا ذہین بچہ ہے۔ اس کے پاس تو بہت سی معلومات ہیں۔ اب سب غور سے سنو! کیچوا قدرتی ہل یا ٹریکٹر ہے۔ یہ زمین کی مٹی کو کھاتا ہے۔ مٹی بطور بے کار مادے کے خارج کرتا ہے۔ یہ مٹی کے پیچیدہ ذرات کو سادہ ذرات میں تبدیل کر کے زمین کو زرخیز بناتا ہے۔ اب ہم اس قدرتی ٹریکٹر کو مار ڈالیں گے تو یہ قدرتی کام کون کرے گا؟''

اب بچوں کو احساس ہو رہا تھا کہ کھیل کھیل میں وہ کتنا ظلم کر رہے تھے۔

''ماموں جی! یہ جو ذیشان نے اتنی ساری تتلیوں کو مارا ہے۔ کیا اب اسے اللہ تعالیٰ سزا دے گا۔'' رمشا نے سوال کیا۔

''اللہ تعالیٰ اسے سزا اس لیے نہیں دے گا کہ پہلے اسے معلوم نہ تھا کہ اللہ رب العزت نے حشرات بے مقصد پیدا نہیں کیے۔ تتلیاں پھولوں کے رس چوستی ہیں۔ پودوں میں باروری (Fertilization) کے عمل میں مدد دیتی ہیں۔ جن کی مدد سے وہ پھل اور بیج پیدا کرتے ہیں۔ ہاں! اگر آج کے بعد ذیشان نے یہ ظلم کیا، علم رکھنے کے باوجود بے عمل رہا تو اللہ تعالیٰ پھر اِسے سزا ضرور دے گا۔'' ماموں جان کی باتوں نے واقعی بچوں کے دلوں پر اثر کیا تھا۔ انہیں پہلی بار احساس ہوا تھا کہ جنگلی حیات کتنی اہم ہے۔ جب کہ ہم درختوں کو کاٹ کر جنگلی حیات سے جینے کا حق بھی چھین رہے ہیں۔ ماموں جان کا مقصد بچوں میں احساس ذمہ داری بیدار کرنا تھا۔ ذیشان کے البم پر لگی تتلیاں سب کو پیغام دے رہی تھیں کہ ہمیں کھو نہ دینا۔ اگر ہم یونہی جانوروں اور حشرات الارض کو مارتے رہے تو آنے والی نسلیں تتلیاں اور کیچوے وغیرہ کہاں سے دیکھ پائیں گی!

مچھلی

استاد (ارشد سے) ''وہ کون سی چیز ہے جو سب سے زیادہ بڑھتی ہے؟

ارشد: ''سر! مچھلی۔''

استاد (تعجب سے) ''وہ کیسے؟''

ارشد: ''میرے ابا جان نے ایک مچھلی شکار کی تھی، وہ جب بھی کسی دوست سے اُس کا ذکر کرتے ہیں تو اُس کی لمبائی کو تین چار انچ بڑھا کر بیان کرتے ہیں'' (صائم اکبر، لاہور)

اشتہار

ایک آدمی نے اخبار کے نمائندہ اشتہارات سے پوچھا: ''جناب، کیا واقعی آپ کے اخبار میں اشتہار دینے کے اچھے نتائج برآمد ہوتے ہیں؟''

نمائندہ: ''نتائج کی کیا پوچھتے ہیں جناب، پچھلے دنوں ایک صاحب نے اپنے گمشدہ کتے کی تلاش کے لیے اشتہار دیا۔''

''پھر؟'' آدمی نے پوچھا۔

نمائندہ: ''پھر کیا، کتا اشتہار پڑھ کر کچھ دنوں بعد خود ہی گھر واپس آ گیا۔'' (نور رمضان، فیصل آباد)

روپیہ

ایک بچہ رو رہا تھا۔ باپ نے رونے کا سبب پوچھا تو بولا:

''ایک روپیہ دیں تو بتاؤں گا۔''

باپ نے جلدی سے ایک روپیہ دیتے ہوئے پوچھا: ''اب بتاؤ کیوں رو رہے تھے؟''

''اس روپے کے لیے ہی تو رو رہا تھا۔'' بچے نے چپ ہوتے ہوئے کہا۔ (امیمہ بابر، سیال کوٹ)

کام

دُکان کا مالک (نئے ملازم سے) ''تمہیں منشی نے کام سمجھا دیا ہے نا؟''

نیا ملازم: ''جی ہاں، انہوں نے کہا کہ جب آپ کو آتا دیکھوں تو فوراً انہیں جگا دوں۔'' (محمد جعفر، گروٹ)

مکھی

دیہاتی (اپنے دوست سے) ''دیکھو میری چائے میں ایک مکھی ہے۔''

دوست: دل چھوٹا نہ کرو، ایک مکھی زیادہ سے زیادہ کتنی چائے پی لے گی۔'' (ایمن پرویز، آزاد کشمیر)

چھتری

''آج صبح میں یہاں اپنی چھتری بھول گیا تھا۔'' ایک غیر حاضر دماغ شخص نے دُکان دار سے کہا۔

''آپ کو کیسے یاد آیا کہ آپ چھتری یہاں بھول گئے ہیں۔'' دُکان دار نے پوچھا۔

''دراصل جب بارش ختم ہوئی تو مجھے چھتری بند کرنے کا خیال آیا، جب میں نے ہاتھ نیچے کیا تو اس میں چھتری نہیں تھی۔'' اُس شخص نے جواب دیا۔ (محمد احمد شہزاد، جہلم)

چابی

چور کسی گھر کا تالا توڑ رہا تھا۔ جب تالا ٹوٹ گیا تو چور نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مالک مکان کھڑا تھا۔ چور اُسے دیکھ کر گھبرا گیا۔ مالک نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا: ''گھبراؤ مت، تم نے تالا توڑ کر اچھا کیا ہے کیوں کہ اس کی چابی مجھ سے کہیں گم ہو گئی ہے۔''

(کائنات اکرم، پشاور)

☆......☆......☆

عظیم رہبر

سید نظر زیدی

پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے۔ مسلمان طالب علموں کی انجمن مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے قائداعظمؒ محمد علی جناح کو لاہور آنے کی دعوت دی۔ قائداعظمؒ طالب علموں کی بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ آپ نے یہ دعوت قبول کر لی اور تاریخ طے ہوگئی کہ کب لاہور آئیں گے اور کتنے دن یہاں قیام کریں گے۔

پنجاب اگرچہ مسلم اکثرت کا صوبہ تھا لیکن اس صوبے میں مسلم لیگ کے بجائے اتحاد پارٹی حکومت کر رہی تھی۔ یہ پارٹی ان ہندو، سکھ اور مسلمان زمین داروں نے مل کر بنائی تھی جن کی سرپرستی انگریز کر رہے تھے۔ انھی کی حمایت سے اس پارٹی کو حکومت ملی تھی۔ پاکستان کی تحریک کو کامیاب کرنے کے لیے ضروری تھا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی حکومت قائم ہو۔

پنجاب مسلمانوں کی اکثریت کا صوبہ تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہاں کے مسلمان پاکستان کی حمایت میں زیادہ پرجوش ہوتے۔ عام مسلمانوں کی حالت ایسی ہی تھی لیکن حکومت پر اتحاد پارٹی کا قبضہ تھا اور یہ بات بہت ضروری تھی کہ اس پارٹی کا زور توڑ کر مسلم لیگ کی حکومت قائم کی جائے۔ طلبا نے قائداعظمؒ کو اسی مقصد کے لیے لاہور بلایا تھا اور خدا کے فضل و کرم سے ان کا یہ دورہ توقع سے زیادہ کام یاب رہا تھا۔ ان کے آنے سے مسلم لیگ کی طاقت بہت بڑھ گئی تھی۔

لاہور تشریف لانے کے لیے قائداعظمؒ نے جو دن مقرر کیا تھا اس پر آپ لاہور پہنچ گئے اور ٹرین سے اترتے ہی اپنی قابلیت کا ایسا ثبوت دیا کہ آپ کے کٹر دشمنوں کو تسلیم کرنا پڑا کہ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں۔ بلکہ ان عظیم انسانوں میں سے ہیں جو صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔ ہوا یہ کہ جیسے ہی آپ ٹرین سے اترے کسی شریر نے ریلوے اسٹیشن کی بجلی بند کر دی۔ اس کا تو خیال تھا کہ بتیاں بجھیں گی تو لوگ اسے ایک بُرا شگون خیال کریں گے اور کہیں گے ان کے آتے ہی اندھیرا ہوگیا۔ لیکن قائداعظمؒ نے اس شرارت کا ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ شرارت کرنے والے کے باپ دادا تک شرمندہ ہو گئے ہوں گے۔ آپ نے اُونچی آواز میں فرمایا۔ ”حضرت! آپ نے دیکھا کہ میرے لاہور پہنچتے ہی اتحاد پارٹی کی حکومت کے چراغ بجھ گئے۔“

یہ ایسا برجستہ فقرہ تھا کہ پورا اسٹیشن قہقہوں اور قائداعظمؒ زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔

تین دن اور تین راتیں بہت مصروفیت میں گزارنے کے بعد قائداعظمؒ لاہور سے رخصت ہونے لگے تو طالب علموں کا ایک گروپ ہوٹل کا بل ادا کرنے کے لیے گیا۔ ان طالب علموں نے یہ رقم آپس میں چندہ کر کے اکٹھی کی تھی۔ وہ ہوٹل کے منیجر سے ملے اور اس سے بل بنانے کے لیے کہا لیکن اس نے یہ کہہ کر انہیں حیران کر دیا کہ بل تو قائداعظمؒ اپنی جیب سے ادا کر چکے ہیں۔

یہ سن کر طلبا بھاگے بھاگے قائداعظمؒ کے پاس گئے اور ان سے کہا۔ ''آپ ہمارے مہمان تھے اور ہوٹل کا بل ادا کرنا ہماری ذمہ داری تھی۔ آپ نے خود یہ بل کیوں ادا کر دیا؟ اور ادا کر ہی دیا ہے تو ہماری درخواست ہے کہ جتنی رقم ادا کی ہے ہم سے لے لیجئے!''

یہ بات سن کر قائداعظمؒ مسکرائے اور طلبا سے کہا۔ ''عزیز بچو! بے شک عام دستور یہی ہے کہ میزبان مہمانوں کا خرچ اٹھاتے ہیں۔ لیکن میرا اور تمہارا معاملہ جدا ہے۔ میں لاہور آیا تو تمہاری دعوت پر ہی ہوں لیکن دراصل اس بڑے کام کے سلسلے میں آیا ہوں جو میں نے اپنے ذمے لیا ہے، یعنی پاکستان کا قیام اور مسلمانوں کو ان کا پورا پورا حق دلوانا۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم نے یہ رقم آپس میں چندہ کر کے اکٹھی کی ہے اور ان دونوں باتوں کا تقاضا ہے کہ ہوٹل کا بل میں خود ادا کروں اور یہی میں نے کیا ہے۔''

طالب علموں نے بہت زور لگایا کہ قائداعظمؒ ہوٹل کے بل کی رقم قبول کر لیں، لیکن وہ رضا مند نہ ہوئے۔ انہوں نے طالب علموں کو سمجھایا: ''ہوٹل کا بل خود ادا کر کے میں نے تم لوگوں کو یہ سبق بھی دیا ہے کہ قوم کی خدمت ہر طرح کے لالچ اور خود غرضی سے آزاد ہو کر کرنی چاہیے اور اگر اللہ نے توفیق دی ہو تو قومی کاموں میں اپنے پاس سے کچھ خرچ بھی کرنا چاہیے اور چوں کہ اللہ نے مجھے اس قابل کیا ہے کہ اپنے پاس سے کچھ خرچ کر سکوں اس لیے ہوٹل کا بل میں نے خود ادا کیا ہے۔ اب تم جاؤ اور اپنی قوم کے ایسے ہی خادم بنو!''

قائداعظمؒ کا دل خود غرضی سے اس طرح پاک تھا کہ وہ قوم کی خدمت کرتے ہوئے اپنے ذاتی فائدوں کے بارے میں سوچتے تک نہ تھے۔ ان کی زندگی کا ایک اور شاندار واقعہ ہے۔

1937ء میں صوبہ بہار کے شہر پٹنہ میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت قائداعظمؒ نے کی۔ قاعدہ یہ تھا کہ سالانہ اجلاس کی صدارت کرنے والا لیڈر آئندہ اجلاس تک مسلم لیگ کا صدر بن جاتا تھا۔ اس اجلاس میں ایک صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ قائداعظمؒ کو تاحیات مسلم لیگ کا صدر بنا دیا جائے، یعنی جب تک وہ زندہ ہیں وہی مسلم لیگ کے صدر مانے جائیں۔ یہ تجویز ان کی قابلیت اور دُوسری خوبیوں کی وجہ سے پیش کی گئی تھی۔ تجویز پیش کرنے والے کا مقصد یہ تھا کہ انہیں تاحیات صدر بنانے سے مسلم لیگ کو بہت فائدہ پہنچے گا، اور یہ بات غلط بھی نہ تھی۔ مسلم رہنماؤں میں ان جیسی قابلیت رکھنے والا ایک رہنما بھی نہ تھا، کوئی اور ہوتا تو یہ تجویز سن کر خوش ہوتا اور اسے منظور کرانے کی کوشش کرتا۔ لیکن قائداعظمؒ نے اس کی مخالفت کی اور فرمایا: ''میں اس بات کو ٹھیک نہیں سمجھتا کہ پوری زندگی مسلم لیگ کا صدر رہوں۔ میری تجویز ہے کہ قاعدے کے مطابق ہر سال مسلم لیگ کا صدر چنا جائے۔ البتہ یہ بات مناسب ہو گی کہ آئندہ اجلاس کے موقع پر آپ لوگ میرے کاموں پر غور کریں اور اگر یہ محسوس کریں کہ میں نے قوم کی خدمت کی ہے اور آئندہ اور زیادہ اچھے کام کروں گا تو مجھے دوبارہ چن لیں۔ لیکن صدر کے چناؤں کا سلسلہ ہر حالت میں جاری رہنا چاہیے۔''

قائداعظمؒ کی اس تقریر کے بعد کس میں ہمت تھی کہ پہلی تجویز منظور کرنے پر زور دیتا۔ چنانچہ وہ واپس لے لی گئی اور مسلمانوں کی اس سب سے بڑی جماعت مسلم لیگ میں جمہوری اصولوں کے مطابق صدر چننے کا طریقہ رائج رہا۔

ان دونوں واقعات سے اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ قائداعظمؒ کو جو عزت اور شان ملی وہ ان کی بہترین قابلیت اور بہت اُونچے کردار کی وجہ سے ملی۔ ان کے کٹر دشمنوں تک نے یہ بات مانی ہے کہ ان کی ذات کھرے سونے کی طرح تھی۔ نہ وہ لالچ میں آتے تھے اور نہ کسی غلط کام میں حصہ لیتے تھے۔ سچ کے راستے پر چلنا اور لالچ کے بغیر قوم کی خدمت کرنا ان کی شان تھی۔ نہ انہیں خریدا جا سکتا تھا نہ گم راہ کیا جا سکتا تھا۔

روشن پبلک سکول کے بچے باغِ جناح پکنک منانے گئے تھے۔ بچے بہت خوش تھے۔ کھیل کود کے بعد بچوں نے مزے دار کھانا کھایا۔ جب پھل کھانے کا مرحلہ آیا تو نعمان نے کیلے کا چھلکا ایک طرف کیا اُچھالا پھر تو سب بچے کیلے اور مالٹوں کے چھلکے ایک دُوسرے کی طرف اچھالنے لگے۔ کچھ دیر میں صاف ستھرا باغ چھلکوں کا ڈھیر نظر آنے لگا تھا۔ سر الطاف نے بچوں کو گھورا تو انہوں نے چھلکے ایک دُوسرے کی طرف پھینکنا بند کر دیے۔ سر الطاف نے آگے بڑھ کر پھلوں کے چھلکوں کو باغ میں رکھے کوڑے دان میں ڈالا تو بچوں نے بھی ایسا کیا۔ پھر سب بچوں نے عہد کیا کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کریں گے۔ جو بچے ایسا کرنے کا عہد کرتے ہیں اُن کے نام اگلے مہینے شائع کیے جائیں گے۔ اس عہدنامے میں شامل ہونے کے لیے کوپن ارسال کرنا ضروری ہے۔

شاباش

ان بچوں نے عہد کیا کہ وہ ہمیشہ سچ بولیں گے۔

حارث تنویر، لاہور۔ کشف ارشد، گوجرانوالہ۔ عائشہ بتول، اسلام آباد۔ ماہین شاہد، جوہرآباد۔ ارم انعم، کراچی۔ حسان بدر، بورے والا۔ علی احمد، وہاڑی۔ محمد نصرت ہاشمی، ملتان۔ عبداللہ وسیم، بنوں۔ صداقت علی، لاہور۔ کومل امجد، ملتان۔ حسیب الرحمٰن، ڈیرہ اسماعیل خان۔ سارہ امیر، راول پنڈی۔ سمیحہ شاہد، لاہور۔ ثمرن عظیم، اسلام آباد۔ رامیل بلوچ، لاہور۔ مصطفیٰ قریشی، ملتان۔ جنید نعیم دیوان، حویلی لکھا۔ سید اشہد، دریا خان۔ مخفی ارم، ساہی وال۔ معاذ احمد، لاہور۔ محمد اسید خالد، ملتان۔ محمد ذیشان، راول پنڈی۔ اریبہ طارق ڈار، سیال کوٹ۔ فتح میں شارق، نوشہرہ۔ انس شاکر، عشرہ امین، ساویہ نواز، افراح اکبر، عبداللہ طیب، احمد حسام الدین، شہزادی خدیجہ، لاہور۔ سحر فاطمہ، لاہور۔ سعدیہ کرن، جوہرآباد۔ سیدہ مسفرہ، ڈیرہ اسماعیل خان۔ حافظ عبدالمقیت چغتائی، ملتان۔ سلیمان جمیل، رائے ونڈ۔ محمد عباس حیدر، راول پنڈی۔ آمنہ اظہار، حیدرآباد۔ عفان عثمان، شیخوپورہ۔ حمنہ بنت بابر، لاہور۔ راشد علی، اوکاڑہ۔

آیئے عہد کریں

کوپن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10 دسمبر 2012ء ہے۔

نام ________ مقام ________

میں عہد کرتا/کرتی ہوں کہ ________

____

____

اَلْمَلِکُ جَلَّ جَلَالُہٗ (حقیقی بادشاہ)

''اَلْمَلِکُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' وہ ہے جو تمام پالنے والوں کا پالنے والا ہے اور ساری دُنیا کا مالک اور تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ یہ مبارک نام قرآن کریم میں 5 مرتبہ آیا ہے۔

جس طرح کسی ملک کا بادشاہ ہوتا ہے اور وہ اس ملک کا انتظام سنبھالتا ہے۔ اسی طرح اس کائنات کا بھی ایک اکیلا بادشاہ ''اَلْمَلِکُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' جسے وہ چاہے بادشاہت دے اور جس سے چاہے بادشاہت چھین کر اُسے فقیر بنا دے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ہم جو چیزیں استعمال کرتے ہیں، ان تمام چیزوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔

ایک کہانی بڑی پرانی

برسوں پہلے کی بات ہے ایک شخص کو اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی بادشاہت عطا فرمائی...... اور اس کی بادشاہت تھی بھی بڑی مضبوط...... اس کے پاس لاکھوں کی فوج تھی...... اس کے دبدبہ سے لوگ کانپتے تھے۔

ایک مرتبہ نجومیوں نے اُسے بتایا کہ ایک بچہ پیدا ہونے والا ہے جو تیری بادشاہت کو ختم کرنے کا سبب ہوگا۔ بادشاہ یہ سن کر ڈر گیا۔ چناں چہ اُس نے حکم دیا کہ جو بچہ بھی پیدا ہو اُسے قتل کر دیا جائے۔ 80 ہزار بچے اس کے حکم پر قتل کر دیے گئے اور کوئی چون و چرا نہ کر سکا۔

اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی حکومت کس قدر مضبوط تھی۔ اس کی فوج بڑی منظم تھی۔ بادشاہ کبھی بیمار نہیں ہوا تھا۔

جی ہاں! آپ صحیح سمجھے...... وہ بادشاہ فرعون تھا...... اللہ تعالیٰ نے اسی کی بادشاہت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔ اور اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھیے اسی فرعون کے گھر میں آپ کی پرورش ہوئی جو آپ کو قتل کر دینا چاہتا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنا نبی بنایا۔ اور انہیں فرعون کے پاس بھیجا کہ وہ سرکش ہوگیا ہے۔ اسے نرمی سے سمجھاؤ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے...... وہی سب کا پالنے والا ہے...... اسی کی عبادت کرنی چاہیے...... لیکن فرعون تو اپنی طاقت کے نشے میں تھا...... اس نے ایک بڑا جملہ کہہ دیا...... اور پھر وہ مقابلے پر آ گیا...... اس نے کہا: ''سب سے بڑا رب تو میں ہوں......''

گویا وہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں آ گیا۔

بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات کو مان لیا۔ وہ نافرمانی چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری کرنے لگے، لیکن فرعون مزید سرکشی پر اتر آیا اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے فوج لے کر روانہ ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے ماننے والوں کے پیچھے لاکھوں کی فوج پڑ گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنی قوم کو لے کر چلے۔ چلتے چلتے آگے دریائے نیل آ گیا...... اب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے دونوں جانب موت تھی، آگے دریا اور پیچھے فرعون کا لشکر۔ کچھ لوگ گھبرا گئے۔ وہ سمجھے کہ اب تو ہم ضرور مارے جائیں گے، لیکن حضرت موسیٰ علیہ اسلام کو تو ''اَلْمَلِکُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' پر پورا بھروسا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ میرے ساتھ ہیں۔ تم گھبراؤ مت......''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ اپنی لاٹھی دریا پر مارو۔

پھر جیسے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے دریا پر ماری تو ''اَلْمَلِکُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' نے دریا میں بارہ راستے بنا دیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی دریا پار کرتے ہوئے آخر کنارے پر پہنچ گئے۔ فرعون دریا کے کنارے پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ اس میں داخل ہو یا واپس پلٹ جائے۔ وہ ''اَلْمَلِکُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' کی طاقت کا کرشمہ دیکھ چکا تھا۔

فرعون کے مشیروں نے کہا: ''اے بادشاہ! یہ راستے تو اصل میں تمہارے لیے بنے ہیں۔'' فرعون پھر تکبر میں آ گیا۔ اور اپنے انسان اور بندے ہونے کو بھول گیا تھا۔ مال اور ملک کے تکبر میں وہ خدائی دعویٰ بھی کر چکا تھا۔

جیسے ہی فرعون اور اس کی فوج دریائے نیل کے درمیان پہنچی...... ''اَلْمَلِکُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' نے دریا کو دوبارہ ملنے کا حکم فرما دیا...... جب وہ پانی میں غرق ہونے لگا، اُسے اپنی موت سامنے نظر آنے لگی اور عقل ٹھکانے آئی تو اب کہنے لگا:

''میں موسیٰ کے رب پر ایمان لاتا ہوں۔''

لیکن اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔

چوں کہ اس نے بہت بڑا دعویٰ کیا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُسے سزا بھی سخت دی۔

فرعون دریائے نیل میں غرق ہو کر مر گیا تو دریائے نیل نے اس کی لاش باہر پھینک دی۔ دریائے نیل بھی اس مردود کو اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ ''اَلْمَلِکُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' نے تمام انسانوں کو عبرت کے لیے اسے قیامت تک محفوظ رکھا ہے۔

آج بھی مصر میں فرعون کی لاش دُنیا والوں کے لیے عبرت ہے۔ اور اس کی لاش بتا رہی ہے کہ بادشاہ صرف اللہ تعالیٰ ہے...... زمین و آسمان میں اسی کی حکومت ہے...... اور جو لوگ اس دُنیا میں بادشاہ کہلاتے ہیں، ان کی بادشاہت ایک دن ختم ہو جائے گی۔

وتر کی نماز میں جب پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سلام پھیر لیتے تو تین مرتبہ ''سُبْحَانَ الْمَلِکِ الْقُدُّوسِ'' پڑھتے۔

ترجمہ: ''ہمارا بادشاہ پاک اور ہر طرح کے عیب سے پاک ہے۔''

قائداعظمؒ کی عظمت

قیامِ پاکستان کے بعد ایک غیر ملکی صحافی نے قائداعظمؒ سے کہا: ''آپ کتنے خوش نصیب ہیں، آپ نے اپنی قوم کے لیے ایک الگ ملک حاصل کر لیا۔ آپ بانئ پاکستان ہیں۔''

قائداعظمؒ نے جواب دیا: ''میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ پاکستان میری زندگی میں بن گیا لیکن میں پاکستان کا بانی نہیں ہوں۔''

غیر ملکی صحافی نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا: ''اگر آپ اس مملکت کے بانی نہیں ہیں تو پھر کون ہے؟''

قائداعظمؒ نے جواب دیا: ''ہر ایک مسلمان۔'' یہ سن کر وہ صحافی بہت حیران ہوا۔ عزیز ساتھیو، ہمیں چاہیے کہ ہم پاکستان کی تعمیر و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ کیوں کہ یہ پاکستان کسی ایک فرد کا نہیں بلکہ ہم سب کا ہے۔ یہ ہمارے بزرگوں کی لاتعداد قربانیوں سے بنا ہے۔ آج ہم جو کچھ بھی ہیں اسی کی وجہ سے ہیں۔

(روبینہ شاہین، سرگودھا)

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

ایاز کا ایک دوست ملازمت کے سلسلے میں بیرون ملک جا رہا تھا۔ جہاز کی روانگی 4 بجے تھی۔ ایاز یوں تو گھر سے جلدی نکلا تھا، مگر وہ ٹریفک میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ اس کے دوست کا بار بار فون آ رہا تھا۔ گاڑی چلاتے ہوئے اُس نے کئی بار موبائل فون کے ذریعے اپنے دوست سے بات کی تھی۔ ایک چوک میں ٹریفک سارجنٹ نے اُسے روک کر گاڑی کے کاغذات طلب کیے اور اُس کا چالان کر دیا۔ ایاز نے ٹریفک کے اشاروں کی خلاف ورزی بھی نہیں کی تھی اور اس کی گاڑی کے کاغذات بھی پورے تھے، مگر اس کے باوجود اس کا چالان کر دیا گیا۔ ایاز کی طرح آپ بھی حیران ہوئے ہوں گے کہ ایسا کیوں ہوا تھا۔ ٹریفک سارجنٹ نے جب چالان کرنے کی وجہ بتائی تو ایاز شرمندہ ہو گیا تھا۔ ایاز کو تو چالان کی وجہ معلوم ہو چکی ہے۔ آپ نے کھوج لگانا ہے کہ ٹریفک سارجنٹ نے ایاز کا چالان کیوں کیا تھا۔
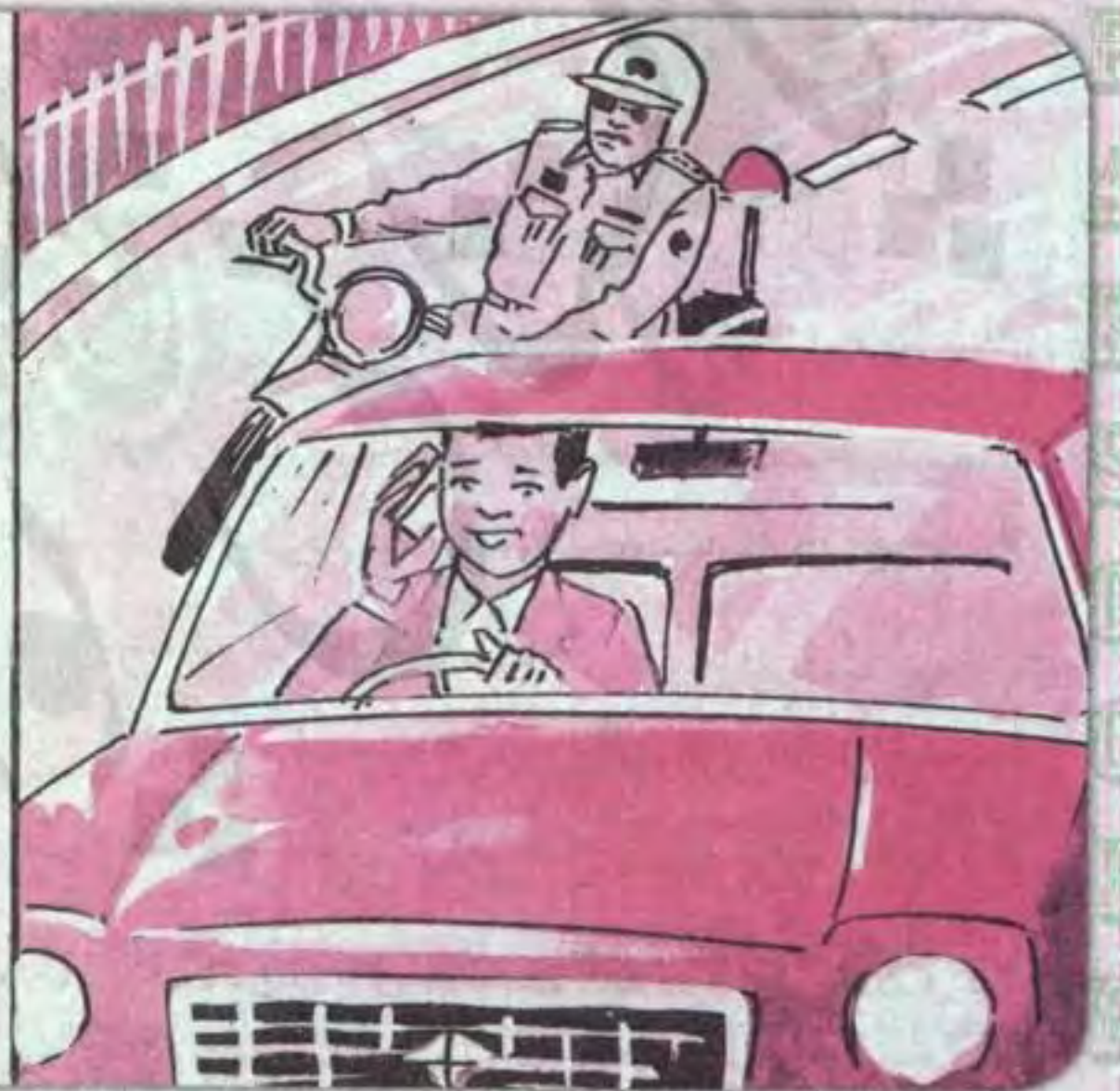
نومبر 2012ء میں شائع ہونے والے ''کھوج لگائیے'' کا صحیح حل: پتنگ کا ''پ''، شیر کا ''ش''، اونٹ کا ''ا''، وکیل کا ''و'' اور ریل گاڑی کا ''ر'' ملایا جائے تو پاکستان کے شہر ''پشاور'' کا نام بنتا ہے۔

1۔ محمد ابراہیم چٹھہ، گوجرانوالہ
2۔ عمار قیصر، پشاور
3۔ حسان بدر، بورے والا
4۔ عدیل حسن، لاہور
5۔ کامران خلیل، ہری پور

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 دسمبر 2012ء ہے۔

کھوج لگائیے!

نام: ____________________

پتا: ____________________

____

''یہ دیکھو، سعد ---- یہ دیکھو ---- میں نا اب ---- پٹ پٹ پٹاک کو خوش کردوں گا، وہ اب ہمارے گھر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی، سمجھے تم، وہ خوش ہوجائے گی جیسے ہی وہ اپنے پُرانے گھر میں واپس آئے گی، یو ---- یو --- یو (جو) ہمارا بھی گھر ہے ناتو وہ واپس آکر خوش ہوجائے گی نا --- یو --- یو ---- (جو) امّاں کہتی ہیں نا کہ اے ہے نگوڑی پٹ پٹ دُوسرے کے گھر میں کیسے مزے سے رہ رہی ہے، ذرا اپنے جھابے (ڈربے) کو یاد نہیں کرتی ---- تو وجہ یہ تھی کہ پَٹ پَٹ پٹاک کا گھر بہت گندا ہو رہا تھا اور اس وجہ سے وہ چلی گئی تھی، اب میں نے اس کو بالکل نیا بنا دیا ہے ، دس دن کی چھٹیوں کے بعد سکول بھی کھل جائیں گے نا تو میں نے اپنا ہوم ورک بھی مکمل کرلیا ہے، سعد تم نے اپنا ہوم ورک کرلیا پورا ، ورنہ مِس بہت ناراض ہوں گی اور ابا کی چائے بھی بالکل پھیکی ہوجائے گی، سوچ لو!''

محمد حسن نوید میاں بی بی پٹ پٹ پٹاک کا ڈربہ مختلف رنگوں کے قلم لے کر سجا رہے تھے، اس پر گل بُوٹے بنا رہے تھے۔ سعد میاں اُن کے نزدیک ہی حیران کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور انہیں دُکھ اس بات کا تھا کہ حسن میاں اس وقت ''بڑے بھائی جان'' کا کردار ادا کررہے تھے اور سعد میاں کو ڈربہ سجانے کی قطعی اجازت نہیں تھی۔

''نہیں ---- نہیں ---- بھائی --- میں ہوم ورک نہیں --- پنسل ٹوٹ گئی ---- یُوں!'' محمد سعد میاں نے حسبِ معمول مختصر بات چیت میں اپنی کلائی کو مروڑتے ہوئے بتایا کہ نہیں بھائی! میں نے اپنا ہوم ورک مکمل نہیں کیا کیوں کہ میری پنسل ایسے کر کے ٹوٹ گئی تھی (اس کے بعد سعد میاں نے اپنی ننھی سی کلائی کو مروڑ کر پنسل کے ٹوٹنے کا اشارہ بھی کیا تھا) حسن میاں بھی آخر ''ابا'' ہی کے پوتے تھے، فوراً بولے:

''سعد ---- تم غلط بات کرتے ہو، اتنی مہنگائی کے زمانے میں تم روزانہ پنسلیں توڑتے ہو، میں ابا سے کہہ دوں گا جا کر کہ تم کاہل بچّے ہو اور سارے زمانے کے کھیل کود میں دل لگتا ہے تمہارا، پڑھائی میں تم ماٹھے ہو، ہی ہی ہی !!!''

حسن میاں کو اپنی امّاں کی نقل اُتارتے ہوئے خود ہی ہنسی آگئی۔ سعد میاں بھی ہنسے اور اپنے دونوں ننھے ننھے ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیے کیوں کہ وہ سمجھ گئے تھے کہ بھائی، امّاں کی نقل اتار رہا ہے اور اگر بابا یا ماما دیکھ لیں گے تو ہمیشہ کی طرح بھائی کی پٹائی

ہو گی کہ بڑوں کی نقل نہیں کیا کرتے۔

''بھائی ۔۔۔میں ۔۔۔میں ۔۔۔پٹ پٹ گھر سجاؤں ؟'' آخر کار بہت دیر بعد محمد سعد نوید میاں کے ننھے سے دل کی خواہش اُن کے لبوں تک آ ہی گئی۔

حسن میاں کو اپنے ننھے سے بھائی پر بہت ترس آیا اور پھر یہ خوف بھی تھا کہ ہے تو سعد بھی ابا ہی کا پوتا، اگر اسے اس کا حق نہ دیا تو ابا اس حق تلفی کو کبھی معاف نہیں کریں گے اور سزا کے طور پر اُن کے کئی انعامات اور چیزیں بھی رُک سکتی ہیں جو ابا گاہے گاہے اُنہیں دیا کرتے ہیں۔ یہ سوچ کر حسن میاں فوراً بولے: ''ہاں ہاں !!! سعد۔۔۔ پٹ پٹ تمہاری بھی تو ہو گی نا! جب وہ ہمارے گھر آجائے گی تو تم بھی اس کے ساتھ احتیاط سے کھیلنا تاکہ کاٹ نہ لے وہ تمہیں!'' اس وقت حسن میاں مکمل طور پر ''بڑے'' بنے ہوئے تھے۔

''نہیں ۔۔۔نہیں ۔۔۔۔بھائی ۔۔۔میں پَٹ پَٹ دُور سے۔۔۔!''

سعد میاں نے خوب سوچ کر جواب دیا کہ نہیں نہیں بھائی میں تو پَٹ پَٹ کو دُور ہی سے دیکھوں گا۔ قریب نہیں جاؤں گا۔

حسن میاں نے ایک گلابی رنگ والا قلم سعد کو دیا اور کہا کہ اس سے پَٹ پَٹ کے دروازے پر ایک مکی ماؤس بنا دو۔ سعد میاں کو ڈرائنگ خاص نہیں آتی تھی، پھر خوب صورت رنگین قلم چھن جانے کا بھی ڈر تھا۔ اس لیے اُنہوں نے ڈربے کے دروازے پر کراس (کاٹ کے نشان) اور گول دائرے بنانے شروع کر دیے۔ ابھی حسن میاں، سعد کے شاہکاروں پر اپنی ماہرانہ رائے دینا ہی چاہتے تھے کہ اچانک وہ اور سعد بُری طرح اُچھل پڑے کیوں کہ عقب (پیچھے) سے ابا کے ہنسنے کی دردار آوازیں آنا شروع ہو چکی تھیں: ''ٹھا ٹھا ٹھا۔۔۔ہا ہا ہا۔۔۔خا خا خا۔۔۔ہو ہو ہو۔۔۔ارے بھئی سعدو میاں تم تو تجریدی آرٹ کے ماہر مصور ہو!''

سعد تو خوب ہنسے۔ البتہ حسن میاں کے لیے دو الفاظ بالکل نئے تھے ''تجریدی آرٹ'' اور ''مصور''، انھوں نے جلدی سے پوچھا: ''ابا! یہ تجدیری آرٹ اور مصور کیا ہوتا ہے؟'' ابا پھر ہنسے اور بولے:

''تو تلے مٹھو۔۔۔۔تجدیری نہیں، تجریدی، یعنی ایسی چیز جس کو سمجھنے کے لیے پورا دماغ کا زور لگانا پڑتا ہو اور وہ چیز بہت ہی اچھی ہو جیسے سعد کی ڈرائنگ اور مصور تصاویر بنانے والے کو کہا جاتا ہے، جو بہت ہی ماہر افراد ہوتے ہیں اور کسی بھی خیال کو تصویر کی شکل میں پیش کر دیتے ہیں، خصوصاً بچوں کی کہانیوں کی تصاویر بنانے والے مصور حضرات تو بہت ہی قابل اور سمجھ دار ہوتے ہیں کیوں کہ بچوں کے لیے لکھنا اور اُن کی پسند کی تصویریں بنانا تو بہت ہی مشکل کام ہے نا!''

ابا خوب مسکرائے۔ محمد حسن نوید میاں سمجھ گئے کہ اب ابا پھر سے اپنی تعریف شروع کر دیں گے کہ میں تو بچوں کی کہانیاں لکھتا ہوں فوراً بولے: ''ابا، اب آپ اپنی تعریف شروع نہیں کر دیجیے گا، ساری دُنیا آپ کی تعریف کرتی ہے لیکن پھر بھی تمہارے ابا شہرت کے بھوکے ہی رہے۔۔ہائے ہائے!!!''

جلدی جلدی میں حسن میاں کے منہ سے امّاں کی بات بغیر تبدیل کیے نکل گئی اور ابا نے فوراً پکڑ لی: ''اوہو۔۔۔تو گویا تمہاری امّاں ہماری شہرت سے جل گئی ہیں۔۔۔ٹھا ٹھا ٹھا، ہاہاہا، حالانکہ تمہاری امّاں کو تو خوش ہونا چاہیے کہ اُن کا سرتاج (شوہر) ایک مشہور بچوں کا ادیب ہے، خیر چلو، ہم تمہیں کہانیاں دلوا کر لاتے ہیں اور وہ ہوم ورک!''

ابا نے سوالیہ نظروں سے سعد میاں کے چہرے کو غور سے دیکھا کیوں کہ انہیں پتا تھا کہ سعد میاں نے ہوم ورک نہیں کیا ہو گا۔ سعد میاں اُس وقت سرخ رنگ کا خوب صورت سوئٹر پہنے ہوئے تھے اور اس پر کئی جگہ رنگین قلم کے نشانات بھی لگا چکے تھے۔ ابا کے پوچھنے پر ہڑبڑا کر بولے:

''میں کام ختم نہیں۔۔۔کل کروں گا!'' یعنی میں نے کام ختم نہیں کیا، کل کرلوں گا۔ ابا اُن کے سچ بولنے پر خوش ہوئے مگر ساتھ ہی اُن کی سُستی پر غصہ بھی آنے لگا۔ کہانیوں کا سُن کر تو حسن میاں بے قابو ہو گئے کیوں کہ اُن کو بچوں کی رنگ برنگی کہانیاں اور نظمیں تو بہت ہی پسند تھیں اور اُن کو پڑھ کر وہ اپنی اُردو

بھی ٹھیک کرلیا کرتے تھے، فوراً بولے: ''ابّا چلیں۔۔۔چلیں، ایک کہانی ارسلان کے لیے بھی دلا دیں، اس کو اُردو میں کچھ مشکل ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے، چلو، ماما کو بتا کر آؤ، پھر شام کو تو پَٹ پَٹ آجائے گی!''

سچ پوچھیے تو پَٹ پَٹ کے واپس آجانے کی خوشی میں حسن میاں کا خوشی سے بُرا حال تھا۔پَٹ پَٹ پٹاک اُن کی پسندیدہ مُرغی تھی، جسے امّاں نے مائی نوراں بھاگی سے خریدا تھا اور ان دنوں سعیدہ خالہ اپنے چھوٹے بیٹے کو اُس کے انڈے کھلانے کے لیے اپنے گھر لانڈھی لے گئی تھیں۔لانڈھی میں سعیدہ خالہ کا بہت بڑا سا گھر تھا، جس کے صحن میں بی بی پَٹ پَٹ پٹاک خوب پَر پھیلا کر پَٹ پَٹ کر کے بھاگا کرتیں۔ حسن اور سعد میاں دو مرتبہ پٹ پٹ سے ملنے سعیدہ خالہ کے ہاں گئے تھے۔پَٹ پَٹ بھی اُن دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں اور اس طرح پٹ پٹ کرنے لگیں جیسے کہہ رہی ہوں:

''تم لوگ فکر نہ کرو حسن اور سعد، میں تمہارے ساتھ اگلے مہینے گھر چلوں گی، ابھی تو میں رضوان کو خوب مزے مزے کے انڈے کھلا رہی ہوں، ناشتے میں اور کبھی کبھار رات کو، کیوں کہ اس کو ڈاکٹر صاحب نے دیسی انڈے کھانے کی ہدایت کی ہے اور تم تو جانتے ہی ہو کہ پوری دُنیا میں میرے ہی انڈے مشہور و معروف ہیں!'' یہ آخری بات حسن میاں کو ابّا نے بتائی تھی کہ پٹ پٹ بھی اپنی تعریفیں خود ہی کرتی ہے اور اس ہی نے اُن کو بتایا تھا کہ اُس کے انڈے پوری دُنیا میں اپنے ذائقے اور مزے کے لیے مشہور ہیں۔

حسن اور سعد کو دیکھ کر سعیدہ خالہ کا بیٹا رضوان بولا:

''حسن! کیا تم لوگ اپنی پٹ پٹ کو واپس لے جاؤ گے؟''

''ہاں تو اور کیا، وہ تمہاری مُرغی تو نہیں ہے نا، امّاں نے ہم سے پوچھے بغیر دے دیا تھا اسے تمہیں۔''

''لیکن اس کے بغیر تو میں بہت اداس ہو جاؤں گا نا!'' رضوان بولا۔

''کیوں۔۔۔کیا ہم بچّے نہیں ہیں، تم دُنیا میں واحد انوکھے بچّے ہو، سنو پَٹ پَٹ پٹاک ہماری مرغی ہے اور جس طرح ہم اُسے ملنے آجاتے ہیں تو تم بھی خالہ کے ساتھ اس سے ملنے ہمارے گھر آجایا کرنا رضوان!''

حسن میاں لڑاکا عورتوں کی طرح باقاعدہ رضوان سے لڑنے لگے تھے اور امّاں اُن کا شور سن کر ہنستی ہوئی باہر آئیں اور حسن کو دیکھتے ہوئے پیار سے بولیں:

''ہائے، ہائے حسن میاں، کیسے لڑ رہے ہو بھائی سے؟ پٹ پٹ بھی دیکھ کر کیا کہے گی اور اپنے چوزوں کے ساتھ خوب مذاق اُڑائے گی تمہارا!''

''ہاہاہا!!!'' رضوان اور سعد میاں بھی ہنسنے لگے تو حسن نوید میاں شرما گئے۔

''اے ہے مُرغی کا جینا بھی حرام کر دیتے ہیں اور اس سے دُلار بھی اتنا ہے!'' سعیدہ خالہ ہنستے ہوئے بولیں۔

اس کے بعد سعیدہ خالہ نے اُن سب کو مزے دار گاجر کا حلوا اور پٹ پٹ کے اُبلے ہوئے انڈے کھلائے۔ یہ انڈے انہوں نے جمع کر لیے تھے کیوں کہ رضوان کبھی کبھی انڈا نہیں بھی کھاتا تھا۔ گھر والوں کے لیے تو بازار سے انڈے آیا کرتے لیکن رضوان میاں کے لیے بطورِ خاص بیگم پَٹ پَٹ روزانہ ایک انڈا پیش فرمایا کرتیں۔

کہانیاں بہت ہی مزے دار تھیں۔ حسن میاں نے اٹک اٹک کر پوری کتاب پڑھ لی اور بولے: ''میں بھی بڑا ہو کر بچوں کے لیے مزے مزے کی کہانیاں لکھوں گا اور خود ہی تصویریں بھی بناؤں گا، پہلی کہانی پٹ پٹ پر لکھوں گا، ہاہاہا، ابّا نے کتنا اچھا نام رکھا ہے اس کا اور بی بی کُٹ کُٹ کٹاک کا بھی، ابّا بہت عقل مند ہیں نا۔۔۔'' حسن میاں سوچ سوچ کر مسکرانے لگے۔

شام تک بی بی پٹ پٹ پٹاک واپس تشریف لے آئیں۔ اپنے ڈربے کو سجا سنورا دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور فوراً سمجھ گئیں کہ یہ حسن اور سعد کا کارنامہ ہوگا، چنانچہ انھوں نے پیار بھری نظروں سے حسن اور سعد میاں کی طرف دیکھا اور آہستہ سے ''پَٹ پَٹ'' کہا یعنی حسن میاں اور سعد میاں آپ دونوں کا شکریہ، لیکن اگلے ہی لمحے جوں ہی اُن کی نظر اپنے ڈربے کے برابر والے چھابے پر پڑی

جس میں بی بی کُٹ کُٹ کٹاک انہیں دیکھ کر انتہائی غیض و غضب (غصّے) کے عالم میں تیزی کے ساتھ ”کُٹ کُٹ کٹاک“ کر رہی تھیں تو بی بی پٹ پٹ کو انتہائی غصہ آیا:

”پٹ پٹ ---پٹ پٹ ---پٹ پٹ پٹاک پٹاک --پٹاک---پٹ پٹھ پٹھ---پٹاخ پٹاخ----پٹاک ک ک ک!“

”کُٹاک ---کُٹ کُٹ --کٹاک کٹاک---کٹاخ کٹاخ ---کٹ کٹ کٹاک----!!“ بی بی کُٹ کُٹ بھی کسی سے کم نہ تھیں۔

”اوہو یہاں تو جنگ چھڑ چکی ہے، بیگم--- خدارا اس بار سعیدہ کو گستاخ کُٹ کُٹ کٹاک کو دے آیئے، اسے لڑنے کا بہت ہی شوق ہے!“ ابا کو غصہ آ گیا۔

”کٹ کٹ کٹاک ک ک !!!“ بی بی کُٹ کُٹ حسبِ عادت سخت غصہ میں تھیں۔

”ارے یہ تو ایسے لڑ رہی ہے جیسے پَٹ پَٹ سے حسد کرتی ہو، حالانکہ حدیث پاک ﷺ ہے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ خشک اور سُوکھی لکڑیوں کو، اب مجھے اندازہ ہوا کہ بی بی کُٹ کُٹ تو اپنے سوا کسی کو برداشت ہی نہیں کر سکتیں، ہائے ہائے افسوس، حالانکہ مل جُل کر محبت سے رہنے ہی میں سب کا فائدہ ہوتا ہے اور اللہ بھی خوش ہوتا ہے، مجھے لگتا ہے کہ اگر اِن دونوں کو ڈربوں سے نکالا گیا تو یہ ایک دُوسرے کو اپنی چونچوں اور پنجوں سے لہولہان کر دیں گی۔--خبردار حسن اور سعد تم دونوں اِس سر پھری کُٹ کُٹ کے پاس مت جانا، کاٹ کھائے گی، کل ہی اسے مائی نوراں بھاگی کو واپس کروں گی، میرے بچوں کو کاٹ کھائے گی پگلی!“ امّاں افسوس کے ساتھ بولیں۔حسن میاں کو بھی خودغرض کُٹ کُٹ کٹاک پر بہت غصہ آیا جو پَٹ پَٹ جیسی اچھی مُرغی کے ساتھ دوستی کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ اُنھیں ڈر بھی لگا کہ کہیں یہ کاٹ نہ لے غصہ میں، کیوں کہ بابا بتاتے ہیں کہ غصہ کرنا حرام ہوتا ہے یعنی بہت بڑا گناہ ہوتا ہے نا! حسن میاں اپنی سوچوں میں گُم تھے کہ اچانک کچھ دیر بعد سب لوگوں کے ہنسنے کی آوازوں سے چونکے، کیوں کہ محمد سعد نوید میاں اپنے اور حسن میاں کے

پاکستان میں مصوری کے شعبے میں نمایاں مقام کے حامل نام ور مصور محمود حسن رومی کہتے ہیں۔

ڈرائنگ

ٹیکنالوجی میں آگے بڑھنے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

دودھ پینے والے رنگین گل دار پیالوں میں ٹھنڈا پانی بھر کر بی بی کُٹ کُٹ کٹاک اور بی بی پَٹ پَٹ پٹاک کے ڈربوں کے سامنے رکھ کر اپنی گردن کو انکار میں ہلا ہلا کر کہہ رہے تھے: ”لڑنا گندی بات ہے ---لڑو نیں (نہیں) اور ٹھنڈا پانی پیو ---نیں (نہیں) لڑو گندی کُٹ کُٹ !!!“

یہ دیکھ کر ابا نے ہنستے ہوئے سعد میاں کو اپنی گود میں اُٹھا کر کہا: ”اور اب اگر کُٹ کُٹ بی بی، تم لڑیں تو ہم تمھیں گنجا کر دیں گے، ٹھا ٹھا ٹھا!!!“

”پٹ پٹ پٹ ----پٹاک ---ابا پٹ پٹ پٹاک۔“ اچانک بی بی پٹ پٹ زور زور سے بولیں جیسے ابا کی بات پر قہقہے لگا رہی ہوں اور پھر انہوں نے حسن اور سعد کو پیار بھرے انداز میں، ہلکے سے اپنا پَر بھی مارا جیسے اپنا ڈربہ سجانے اور کُٹ کُٹ کو سمجھانے پر اُن دونوں کو شکریہ ادا کر رہی ہوں۔اب بی بی پٹ پٹ، بڑی شان کے ساتھ مٹکتی ہوئی اپنے سجے سنورے ڈربے میں داخل ہو گئیں۔ حسن میاں نے خورشید انکل سے رنگ برنگی جھالریں بھی لا کر اُن کے ڈربے کو مزید سجا دیا تھا نا!!!

ٹھیک ہے نا دوستو، جو ہمارے کام آئے، ہمارا خیال رکھے، اس کا ہمیں شکریہ تو ادا کرنا چاہیئے نا---کُٹ کُٹ کٹاک ک ک---معاف کیجئے گا، پٹ پٹ پٹاک ک--- اوہو--- پھر معاف کیجئے گا، اصل میں بی بی کُٹ کُٹ کٹاک اور پَٹ پَٹ پٹاک کے ہنگامے میں ہم تو اپنی بولی بھی بھول گئے---ہے نا غلط بات!!!

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ قرآن مجید میں صفا و مروہ کو "شعائراللہ" کہا گیا ہے۔ اس لفظ کا مطلب کیا ہے؟

i۔ اللہ تعالیٰ کا جلال ii۔ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں iii۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں

2۔ 9 ہجری میں کس فرض کی ادائیگی کا حکم نازل فرمایا گیا تھا؟

i۔ نماز ii۔ روزہ iii۔ حج

3۔ حضرت داؤد علیہ السلام پر کون سی الہامی کتاب نازل ہوئی تھی؟

i۔ انجیل ii۔ زبور iii۔ تورات

4۔ حضرت ابی بن کعبؓ کو کس فن کا امام کہا جاتا ہے؟

i۔ فنِ قرأت ii۔ فنِ حرب iii۔ فنِ علم الحدیث

5۔ انسانی جسم کا کیمیائی کارخانہ کس عضو کو کہا جاتا ہے؟

i۔ دل ii۔ گردے iii۔ جگر

6۔ پارے والے تھرمامیٹر کے موجد کا نام بتائیے۔

i۔ ایڈیسن ii۔ فارن ہائیٹ iii۔ ولیم ہاروے

7۔ آنکھ کے پردے کی جراحی کے لیے کن شعاعوں کا استعمال کیا جاتا ہے؟

i۔ لیزر شعاعیں ii۔ تابکار شعاعیں iii۔ الفاریز

8۔ پاکستان کے کس شہر کو "مردوں کا شہر" کہا جاتا ہے۔

i۔ ہڑپہ ii۔ موہنجوداڑو iii۔ ٹیکسلا

9۔ نامور شاعر نظیر اکبر آبادی کی وفات کس مرض کے سبب ہوئی تھی؟

i۔ فالج ii۔ کینسر iii۔ ذیابیطس

10۔ بیس بال کے میدان کو کیا کہا جاتا ہے؟

i۔ کورٹ ii۔ ڈائمنڈ iii۔ ہال

جوابات علمی آزمائش نومبر 2012ء

1۔ سورۃ مریم 2۔ حضرت نوحؑ 3۔ امین الامت 4۔ اپی ڈرمس 5۔ بلندی۔ 6۔ 1952ء 7۔ سید سلیمان ندوی 8۔ گڈریئے کی لاٹھی 9۔ دو آبہ 10۔ 1974ء

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ حبیب الرحمٰن غنی، ڈیرہ اسماعیل خان (200 روپے کی کتب)

☆ شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور (175 روپے کی کتب)

☆ انس بن زکریا، راول پنڈی (125 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: طارق عزیز، کوٹری۔ جویریہ ذوالفقار، لاہور۔ طٰہٰ یٰسین، حیدرآباد۔ محمد یحییٰ محمود، فیصل آباد۔ سید اشہد بخاری، دریا خان۔ حافظہ رافعہ میمونہ، راول پنڈی۔ شاہ زیب ذیشان، لاہور۔ فہد زمان، کرک۔ انصر علی، وہاڑی۔ محمد شہزاد بھٹی، بورے والا۔ صداقت علی، لاہور۔ کامران حیات، راول پنڈی۔ کومل امجد، ملتان۔ حامد رضا قادری، کامونکی۔ جنید نعیم دیوان، حویلی لکھا۔ زیب النساء، لاہور۔ الوینہ گل، کوہاٹ۔ شاویز احمد، لاہور۔ ثمرن عظیم، اسلام آباد۔ مریم ہاشمی، صباحت۔ محمد حارث جمیل، لاہور۔ راشد علی، محمد شمیم عالم، اوکاڑہ۔ اُروی معطر بیگ، گجرات۔ محمد معید حیدر مرزا، آمنہ عرفان، راول پنڈی۔ محمد حسن رضا، جوہر آباد۔ نگینہ رشید، سید محمد اسامہ ہاشمی، لاہور۔ بختاور رضوان، میرپور۔ زاوش جدون، ایبٹ آباد۔ سیدہ مسفرہ ساعد، ڈیرہ غازی خان۔ حافظ حمزہ علی، عارف والا۔ مطیع اللہ بیگ، لاہور۔ سعد فجر، ساہی وال۔ حافظ عبدالمتین چغتائی، ملتان۔ مریم نفیس، کراچی۔ زینب بی بی، میاں والی۔ حامد شاہ، لاہور۔ ساجد صغیر، فیصل آباد۔

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 دسمبر 2012ء ہے۔

دماغ لڑاؤ

نام: ____________

مقام: ____________

پتا: ____________

نگہت یاسمین

پر کام کروں گا بڑے بڑے

ہنستی ہوئی مس مہر سٹاف روم میں داخل ہوئیں اور ہاتھ دھو کر چائے پینے بیٹھ گئیں۔ کھلی ہوئی کھڑکیوں سے ٹھنڈی ہوا، پھولوں کی خوش بو اور بچوں کی ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔

''کیوں بھئی کیسا رہا بچوں کا شجرکاری کا پروگرام؟'' مس ایمن نے بات شروع کی۔

مس مہر نے سینڈوچ پلیٹ میں رکھا۔ ''بہت زبردست''

''میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس قدر اچھا ردعمل دیکھنے کو ملے گا۔ واقعی بچے اُمید کی علامت ہیں۔''

مس مہر بچوں کے جوش و خروش اور سوجھ بوجھ سے بے حد متاثر نظر آ رہی تھیں کہ اچانک بچوں کی آوازیں شور اور بحث میں تبدیل ہوگئیں۔

''میں دیکھتی ہوں۔'' مس سیما نے کرسی دھکیلی۔ مگر اتنی چیخ و پکار سن کر بھلا کون وہاں رکتا۔

''میں تم سے بڑا ہوں۔ کلاس میں بھی اور طاقت میں بھی۔ اس لیے میری بات درست ہے۔'' کلاس چہارم کے جاوید نے جلدی سے تیسری جماعت کے نعمان کو گھسیٹ کر گرا دیا۔

''ارے ارے یہ کیا ہو رہا ہے!'' مس سیما اور مس ندا نے نعمان پر بیٹھنے کی کوشش کرتے جاوید کو پکڑا۔

اُردو کی مس عمرانہ نے عینک کے اُوپر سے جاوید کو گھورا اور اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

''بڑائی عقل سے آتی ہے نہ کہ عمر سے۔''

اس سے پہلے کہ بچے اِس بات کو سمجھتے مس مہر کی نگاہ اجڑی ہوئی کیاریوں پر پڑی۔ اجڑی کیاریاں دیکھ کر ان کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہنے لگے۔ اپنی پیاری مس مہر کو روتا دیکھ کر سارے بچے گم صم ہو گئے تھے۔

''اچھا تو یہ آپ کا کارنامہ ہے۔'' مس عمرانہ نے جاوید کو سر سے پاؤں تک گھورا۔

''تم بڑے ہو اس لیے ہر شے خراب کرنا آپ کا حق ہے۔'' مس ندا بولیں۔

''یہ ننھے ننھے سرخ پھول ہمارے سکول کو کتنا خوب صورت بنا رہے تھے۔'' مس سیما نے بکھری ہوئی مٹی کیاری میں ڈالی۔

''بھینی بھینی خوش بو سے ہم سٹاف روم میں بیٹھے لطف اندوز ہو رہے تھے۔'' مس ندا کا جملہ پورا ہی ہوا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

''مبارک ہو۔ شجرکاری مہم بے حد کامیاب رہی ہے۔ اور میں نے قریبی نرسری سے بات کی تھی کہ وہ بڑے پودے دینے کے

لیے تیار ہیں۔ جہاں سے وہ مختلف پارکوں میں منتقل کیے جا سکیں گے۔'' پرنسپل سب کو کیاریوں کے کنارے کھڑے دیکھ کر اصل بات سے بے خبر بولتی چلی گئیں۔

جاوید، کا چہرہ انہیں دیکھ کر پھیکا پڑ گیا۔ مس مہر نے بکھری پتیاں جمع کر کے مٹی میں دبائیں۔

''اتنی محبت اور دل چسپی سے سارے کام کرنے کے بعد اپنے دوستوں کو اکھاڑ پھینکا......'' پرنسپل نے بچوں اور تمام اساتذہ کو بغور دیکھنے کے بعد سخت لہجے میں کہا۔

''جاوید اگر آپ کو کسی سے شکایت تھی تو مس تک بات پہنچانی تھی۔'' اس کا جھکا ہوا سر اور بکھرے ہوئے بال دیکھ کر وہ سب کچھ سمجھ گئیں۔

''مس، ہم شرمندہ ہیں۔ ہمیں معاف کر دیجیے گا۔'' جاوید کے ساتھی آصف نے آگے بڑھ کر کہا۔

کچھ لمحے خاموشی کے بعد جاوید آگے بڑھا:

''میں بہت شرمندہ ہوں۔'' اُس کی سسکیاں فضا میں اُبھریں۔

محبت ہو تو ایسی......!

اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے نوکر محمد خان کو صرف خان کہہ کر بلایا تو وہ وضو کا پانی لے کر آگے بڑھا۔

''تمہیں کیسے پتہ چلا ہے کہ بادشاہ سلامت نے وضو کے لیے پانی منگوایا ہے؟'' کسی نے نوکر سے سوال کیا۔

نوکر نے جواب دیا: ''بادشاہ سلامت کی عادت ہے کہ وہ بغیر وضو کے میرا پورا نام نہیں پکارتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے نام کا آغاز لفظ محمد سے ہوتا ہے، جب وہ مجھے صرف خان کہہ کر پکارتے ہیں تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ انہیں وضو کے لیے پانی چاہیے۔''

یہ سن کر سوال کرنے والی کی زبان سے بے اختیار نکلا: ''سبحان اللہ، محبت ہو تو ایسی۔''

(اقراء خان، صادق آباد)

''ٹھیک ہے، مگر جو پودے جڑ سے اکھڑ گئے ہیں۔ وہ دوبارہ تو نہیں لگ سکتے۔'' پرنسپل نے افسردہ لہجے میں کہا۔

میڈم کے اشارہ پر مس سیما نے نل سے جاوید اور نعمان کے منہ ہاتھ دھلوا دیے۔ مس ندا نے بچوں کو وہیں قطار میں بٹھا دیا۔

نعمان اور جاوید سب سے آگے تھے۔ پرنسپل ہلکا سا مسکرائیں۔

''معمولی باتوں پر لڑنا اور اپنا نقصان کرنا ہرگز عقل مندی نہیں ہے۔ بعد میں تو صرف افسوس رہ جاتا ہے۔''

''ہم اگر آج سکول کے اندر چیزوں کا خیال رکھتے ہیں تو کل ملک کے کسی پارک، ہسپتال کی دیکھ بھال بھی کر سکتے ہیں۔ ورنہ ہمارے دشمن جو کہتے ہیں کہ پاکستانی آپس میں لڑتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہیں۔''

''بالکل غلط کہتے ہیں۔'' اظہر یہ کہتے ہوئے جوشیلے انداز میں کھڑا ہو گیا۔

''ہم یہ بات غلط ثابت کریں گے اور ایک ہفتے میں پھر سے نئے پودوں کی کیاری تیار کر دیں گے۔'' علی، نے اتنا کہا تو سب بچے یک زبان ہو کر بولے: ''ان شاء اللہ۔''

''میں چھوٹا سا اک لڑکا ہوں پر کام کروں گا بڑے بڑے۔'' بچوں کی آواز فضا میں گونجنے لگی تھی۔

حلوے کی خوش بو

کاشف ضیائی

صدیوں پہلے ایران اور ترکی کی سرحد پر ایک قصبہ توازن نام کا آباد تھا۔ اس قصبے کے بیچوں بیچ ایک لمبی سڑک گزرتی تھی۔ اس سڑک کے دونوں طرف دُکانیں تھیں۔ قصبہ توازن کے اِردگرد چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے جہاں سے لوگ اکثر اس بازار میں خریداری کرنے آتے تھے۔ ایک دن معمول کے مطابق بازار میں کاروبار جاری تھا۔ لوگ آ جا رہے تھے اور ضروریاتِ زندگی خرید رہے تھے۔ ایک حلوائی صبح کے وقت کھڑا دُکان کے باہر حلوہ بنا رہا تھا۔ اُس نے کڑاھے کے نیچے آگ جلا رکھی تھی اور وہ زور زور سے کفگیر چلا رہا تھا۔

لوگ اُس کی دُکان کے سامنے سے گزرتے اور بعض لمحہ دو لمحہ کے لیے ٹھہر بھی جاتے۔ حلوے کی خوش بو دُور دُور تک پھیل رہی تھی۔ اچانک ایک غریب کسان بازار میں داخل ہوا۔ جب وہ حلوائی کی دُکان کے قریب آیا تو تھوڑی دیر کے لیے وہاں ٹھہر گیا۔ حلوے کی خوش بو نے اُسے مسحور کر دیا۔ اُس کی بھوک چمک گئی، لیکن حلوہ خریدنے کے لیے اُس کے پاس پیسے نہ تھے۔ وہ کچھ دیر وہاں ٹھہر کر آگے بڑھنے لگا تو حلوائی کے دل میں نہ جانے کیا خیال آیا کہ اُس نے کفگیر کو کڑاھے میں چھوڑا اور کسان کے گریبان کو پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا پھر بولا:

"میرے حلوے کی خوش بو سونگھنے کے پیسے نکالو۔"

کسان بہت حیران ہوا اور بولا: "بھائی! کیسے پیسے، میں نے حلوہ تو نہیں کھایا میں تو صرف یہاں کھڑا ہوں۔"

حلوائی نے اُس کا گریبان اور مضبوطی سے پکڑا اور بائیں ہاتھ کا مُکا لہراتے ہوئے کہا: "تُو کتنی دیر سے یہاں کھڑا ہے۔ حلوہ پک رہا ہے، خوش بو اٹھ رہی ہے تُو کتنی دیر سے خوش بو سونگھ رہا ہے اس کے پیسے دے مجھے۔"

کسان بولا: "بھائی! بھلا خوش بو کے بھی پیسے ہوتے ہیں۔"

"حلوائی نے کہا: "اور تو کیا نہیں۔ یہ خوش بو گھی اور کھانڈ کی ہے جو اس حلوے میں ڈالی ہے، کیا گھی اور کھانڈ مفت آتی ہے؟ جلدی سے پیسے نکال۔" غرض وہاں اچھا خاصا جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ حلوائی کہتا تھا کہ حلوے کی خوش بو سونگھنے کے پیسے لوں گا جب کہ کسان کہتا تھا کہ خوش بو کے پیسے کس بات کے۔ لوگ یہ جھگڑا دیکھ کر وہاں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں بازار کے بیچوں بیچ خاصے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ اب حلوائی نے یہ بھی کہنا شروع کر دیا تھا کہ جلدی سے پیسے نکال ورنہ اتنا ماروں گا کہ ہڈیاں ٹوٹ جائیں

گی۔ کسان یہ سن کر رونے لگا۔ اچانک ایک طرف سے شور اٹھا کہ قاضی جی آرہے ہیں۔ قاضی نے آکر پوری بات سنی، لیکن وہ بھی تذبذب کا شکار ہو گئے اور کوئی فیصلہ نہ کر پائے۔ معاملہ جوں کا توں رہا۔ حلوائی پیسے مانگتا تھا اور کسان انکار کرتا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ مجمع کے درمیان سے ایک میلے کچیلے حلیے کا شخص لوگوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتا ہوا سامنے آیا اور گرج دار آواز میں بولا:

''قاضی جی! آپ کو فیصلہ کرنے میں دشواری ہو رہی ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں اس مقدمے کا فیصلہ کروں۔''

وہ شخص نیم پاگل تھا۔ لوگ اُسے دیوانہ کہتے تھے۔ وہ سارا دن بازار کے ایک کونے میں پڑا رہتا اور رات کو کسی دُکان کے سامنے اپنی چادر اوڑھ کر سو جاتا۔ لوگوں میں اُس کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ اسی وجہ سے قاضی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کہ یہ دیوانہ کیا فیصلہ کرے گا، لیکن وہ مشکل کا وقت تھا لوگ قاضی کا فیصلہ سننے کے لیے کھڑے تھے۔

قاضی نے فوراً کہا: ''ہاں، ہاں ضرور اگر تم اس مقدمے کا فیصلہ کر دو تو بہت اچھا ہے۔''

اُس دیوانے نے حلوائی سے پوچھا: ''تمہارے حلوے کی خوش بو سونگھنے کے کتنے پیسے بنتے ہیں؟''

حلوائی بولا: ''دس اشرفیاں۔''

دیوانے نے مجمع میں ایک شخص سے کہا: ''بھائی! ذرا مجھے تھوڑی دیر کے لیے اپنی دس اشرفیاں ادھار دینا۔''

اُس شخص نے اپنی تھیلی میں سے دس اشرفیاں نکال کر دیوانے کو دے دیں۔ دیوانے نے انہیں ایک برتن میں ڈالا اور برتن کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اُسے حلوائی کے قریب لے جا کر زور زور سے بجایا پھر پوچھا:

''اشرفیوں کی آواز سنی۔''

حلوائی بولا: ''بالکل سن لی۔''

دیوانے نے کہا: ''کسان نے حلوے کی خوش بو سونگھی اور تم نے اشرفیوں کی آواز سن لی۔ حساب برابر ہو گیا اس طرح تمہارا اور کسان کا حساب بے باق ہو گیا ہے۔''

یہ کہہ کر دیوانے نے اشرفیاں واپس کیں اور ہنستا ہوا واپس چلا گیا۔ جب کہ مجمع کے تمام لوگ حیران تھے کہ جو مسئلہ ایک عالم فاضل قاضی سے حل نہ ہو سکا وہ ایک دیوانے نے نہایت عقل مندی سے چٹکیاں بجاتے ہی حل کر دیا تھا۔

(فارسی ادب سے ماخوذ)

☆......☆......☆

ذہانت

ایک دفعہ ایک اجلاس کے دوران قائداعظمؒ اور کانگرسی لیڈر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ کا ایک آنکھ پر لگانے والا چشمہ جو کہ آپ دائیں آنکھ کی بینائی کمزور ہونے کی وجہ سے لگاتے تھے۔ نیچے گر گیا۔ کانگرسی لیڈروں کا خیال تھا کہ آپ چشمہ اٹھانے کے لیے اُن کے سامنے جھکیں گے۔ آپ نے کانگرسی لیڈروں کی اس بات کو بھانپ لیا اور جیب میں سے دُوسرا چشمہ نکال کر لگا لیا۔ کانگرسی لیڈر منہ دیکھتے رہ گئے اور ان کی اپنے سامنے جناح کو جھکتے ہوئے دیکھنے کی حسرت ان کے دلوں میں ہی رہ گئی۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ایک مشہور ہندو لیڈر آپ کے پاس آیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ گاندھی صاحب آپ سے بڑے لیڈر ہیں۔ آخر وہ گاندھی کے حق میں بولتے ہوئے کہنے لگا کہ گاندھی جی نے ہندوؤں کی فلاح و بہبود کے لیے بہت کام کیا ہے اسی سلسلے میں وہ کئی بار جیل جا چکے ہیں۔ جب کہ آپ تو ایک دفعہ بھی جیل نہیں گئے۔ قائداعظمؒ نے جواب دیا: ''دیکھیے جیل میں وہی لوگ جاتے ہیں جو کوئی جرم کرتے ہیں۔ جب میں نے کوئی جرم نہیں کیا تو میں جیل میں کیوں جاؤں۔''

یہ سن کر ہندو لیڈر آپ کی ذہانت سے بہت متاثر ہوا۔

(ذیشان رضا، کراچی)

مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

نومبر کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ چچا تیز گام کو رسالے میں پا کر خوشی ہوئی۔ آپ اشتیاق احمد کی کہانیاں بھی شائع کیا کریں۔

(علی شہروز، فیصل آباد)

☆ **اس مرتبہ اشتیاق احمد صاحب کی کہانی شاملِ اشاعت ہے۔**

انوکھی دُنیا بہترین ناول ہے۔ چچا تیز گام کی کہانی پڑھ کر مزا آ گیا۔

(کومل امجد، ملتان)

نومبر کا شمارہ بہت پسند آیا۔ اس مرتبہ سرورق عمدہ تھا۔

(محمد جنید، بھوآنہ)

کہانیوں میں مصباح اور مانو اور بنٹی اچھی کہانیاں تھیں۔

(معاذ اکبر، فیصل آباد)

چچا تیز گام کی واپسی اچھی لگی۔ مصباح، دُوسری شرط، مس! آج کیا تاریخ ہے؟ نے دل موہ لیا۔ (حارث تنویر، لاہور)

میں چور نہیں ہوں اور مصباح بہترین کہانیاں تھیں۔

(ماب زینب، جہلم)

چچا تیز گام نے تقریر کی اور مصباح کہانیاں پسند آئیں۔

(رحماء احمد، ملتان)

نظم شکریہ علامہ اقبال بہت اچھی تھی۔ (علی رضا، جھنگ صدر)

نومبر کے شمارے میں کہانی جاؤ نوکری کرو نے ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ کہانی مصباح بھی عمدہ تھی۔ (مقصود احمد منظر، لاہور)

سرورق پر علامہ اقبال کی تصویر اور نظم کا مصرعہ ”علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب“ پڑھ کر دل میں علم کی شمع سے محبت کی شمع روشن ہو گئی۔ (حسن رضا سردار، حامد رضا قادری، کاموکی)

نومبر کا شمارہ اچھا تھا۔ چچا تیز گام کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔

(معز طارق، راول پنڈی)

پیارے اللہ کے پیارے نام بہترین سلسلہ ہے۔

(زیب النساء، لاہور)

انوکھی دُنیا کی ہر قسط کا مجھے شدت سے انتظار ہوتا ہے۔

(مخفی ارم، ساہی وال)

”کہانی نمبر“ کی اشاعت پر میری طرف سے پیشگی مبارک باد قبول کریں۔ (فرحان اشرف، ہارون آباد)

نومبر کے شمارے میں مصباح اور مانو اور بنٹی عمدہ کہانیاں تھیں۔

(معاذ احمد، لاہور)

دُوسری شرط اور نواسۂ رسولؐ حضرت امام حسینؓ اچھی تحریریں تھیں۔

(جنید نعیم، حویلی لکھا)

بچوں کا انسائیکلو پیڈیا بہت زبردست اور معلوماتی سلسلہ ہے۔

(ایس ایم ذیشان شیرازی، ملتان)

میں نے اپنے سکول میں ”تعلیم و تربیت“ کے بہت سے نئے قارئین بنا لیے ہیں، مگر ایک مسئلہ ہے کہ ہمیں یہاں رسالہ بہت کم ملتا ہے اور اگر ملتا ہے تو بہت دیر سے ملتا ہے۔

(اویس اظہر اقبال، گجرات)

☆ **اب آپ کو رسالہ ان شاء اللہ جلد ملا کرے گا۔**

مجھے کہانی ”عاشر کی واپسی“ پر انعام ملا تھا، مگر ابھی تک مجھے انعامی کتب نہیں ملیں۔ (روبینہ ناز، کراچی)

☆ **آپ کو انعامی کتب روانہ کر دی گئی ہیں۔**

نومبر کے شمارے میں مصباح، وقت کا فیصلہ، جاؤ نوکری کرو اور مانو اور بنٹی کہانیاں اچھی تھیں۔ (سعد ندیم، لاہور)

ناول انوکھی دُنیا مجھے بہت پسند ہے۔ سلسلہ پیارے اللہ کے پیارے نام جاری رکھیے گا۔ (محمد مصعب خرم، کراچی)

☆ **یہ سلسلہ جاری رہے گا۔**

نومبر کا شمارہ بہترین تھا۔ چچا تیز گام نے تقریر کی اور جاؤ نوکری کرو اچھی کہانیاں تھیں۔ (سید منہاس محمود، راول پنڈی)

آپ نے میری خواہش پر ٹکٹوں کے موضوع پر مضمون شائع کیا اس کے لیے بہت شکریہ۔ اب آپ کرنسی نوٹوں کے حوالے سے بھی

کوئی مضمون شائع کریں۔ (حلیم اسحاق، جہلم)

☆ آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔

اس بار سرورق بہت خوب صورت تھا۔ مصباح، جاؤ نوکری کرو، مانو اور بنٹی اور میں چور نہیں ہوں اچھی کہانیاں تھیں۔

(محمد احمد رضا انصاری، کوٹ ادو)

بچوں کا انسائیکلو پیڈیا اور دماغ لڑاؤ بہت معلوماتی سلسلے ہیں۔

(انعم محمد حنیف، کراچی)

درسِ قرآن و حدیث ہمیشہ کی طرح بہت اچھا تھا۔ سنہرے لوگ بہترین سلسلہ ہے۔ مانو اور بنٹی کہانی بہت اچھی تھی۔ چچا تیز گام کی واپسی نے خوش کر دیا ہے۔ نظم شکریہ علامہ اقبال اچھی لگی۔

(عفان عثمان، شیخوپورہ)

نومبر کے شمارے میں مصباح، جاؤ نوکری کرو، مس! آج کیا تاریخ ہے؟ اور مانو اور بنٹی عمدہ کہانیاں تھیں۔ (صباء شوکت، گوجرانوالہ)

مضمون نواسۂ رسولؐ حضرت امام حسینؓ پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ پیارے اللہ کے پیارے نام اچھا سلسلہ ہے۔

(محمد شمیم عالم، اوکاڑہ)

میں ایک کہانی ''کشمیر کا بیٹا'' بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ اسے ضرور شائع کریں گے۔ (مدثر بشیر، وہاڑی)

☆ کہانی معیاری ہوئی تو ضرور شائع کی جائے گی۔

نومبر کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ چچا تیز گام کی کہانی بہت عمدہ تھی۔

(عائشہ خالد، راول پنڈی)

کہانیوں میں مصباح، وقت کا فیصلہ، دُوسری شرط اور مانو اور بنٹی بہترین تھیں۔ (عبداللہ، ملتان)

میں چور نہیں ہوں، جاؤ نوکری کرو اور مصباح عمدہ کہانیاں تھیں۔ ''انوکھی دُنیا'' سنسنی خیز ناول ہے۔ نظم شکریہ علامہ اقبال بہت پسند آئی۔ (اُرویٰ معطر بیگ، گجرات)

اس مرتبہ سب سے بہترین کہانی علی اکمل تصور کی مصباح تھی۔ کیا میں انعامی مقابلوں کے لیے پرانے کوپن استعمال کر سکتا ہوں؟

(شہزادہ صغیر، شورکوٹ)

☆ انعامی مقابلوں میں حصہ لینے کے لیے نئے کوپن استعمال کریں۔

نومبر کا شمارہ لاجواب تھا۔ میں مصروفیات کے باعث ''تعلیم و تربیت'' میں کچھ عرصہ نہیں لکھ سکی، لیکن اس دوران اس کو پڑھنا نہیں چھوڑا۔ اب بہت جلد کچھ تحریریں ارسال کروں گی۔

(زینب علی جعفری، اسلام آباد)

چچا تیز گام نے تقریر کی، وقت کا فیصلہ، پیارے اللہ کے پیارے نام عمدہ تحریریں تھیں۔

''انوکھی دُنیا'' بہترین ناول ہے۔ سلسلہ ''آپ بھی لکھیے'' میں کہانیوں کا انتخاب بہ ذریعہ قرعہ اندازی کیا جاتا ہے یا معیار دیکھا جاتا ہے۔ (جویریہ ذوالفقار، لاہور)

کہانیوں کا انتخاب بہ ذریعہ قرعہ اندازی نہیں بلکہ ان کے معیار کے مطابق کیا جاتا ہے۔

ہم ''تعلیم و تربیت'' کی کہانیاں پسند کرتے ہیں۔ ہمارے استاد صاحب ہر ماہ ہمارے لیے تعلیم و تربیت کے دس شمارے منگواتے ہیں۔ جب ہمارا نام انعامی سلسلوں میں نہیں ہوتا تو بہت مایوسی ہوتی ہے۔ (واصف اقبال، میاں والی)

☆ **آپ کا خط پہلی بار ملا ہے اگر آپ کا پہلے خط ملا ہوتا تو یقیناً آپ کے نام بھی انعامی سلسلوں میں شامل کیے جاتے۔**

''آیئے عہد کریں'' بچوں کی اخلاقی تربیت کے لیے بہترین سلسلہ ہے۔ ایسا مفید سلسلہ شروع کرنے پر میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ (رانا شوکت امین، کراچی)

مانو اور بنٹی، مصباح، میں چور نہیں ہوں اور جاؤ نوکری کرو اچھی کہانیاں تھیں۔ (احسان اللہ، ملتان)

چچا تیز گام نے تقریر کی عمدہ کہانی تھی۔ (رانی، ماہم، سیال کوٹ)

بچوں کا انسائیکلو پیڈیا، سنہرے لوگ، کھوج لگایئے، آیئے عہد کریں، کھیل دس منٹ کا اور پیارے اللہ کے پیارے نام رسالے کی جان ہیں۔ ان سلسلوں کو جاری رکھیے گا۔ (دانش خان، پشاور)

☆ یہ سلسلے جاری رہیں گے۔

مانو اور بنٹی، مس! آج کیا تاریخ ہے؟ مصباح اور جاؤ نوکری کرو کہانیاں بہت پسند آئیں۔ (سمیرا بتول، ملتان)

کیا ''انوکھی دُنیا'' کو بعد میں کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا؟

(بلال احمد، لاہور)

☆ ابھی اس حوالے سے کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا۔

"کون سی تیسری کتاب؟" اختر نے سوال کیا۔

"وہ دیکھو شیلف میں پہلے دو کتابیں ہوا کرتی تھیں یہ تیسری کتاب کہاں سے آ گئی ہے۔" یاور کے اشارہ کرنے پر اختر نے شیلف کی طرف دیکھا تو وہاں دو کی بجائے تین کتابیں تھیں۔

ڈولی، رانی اور روشنی دونوں کی باتیں سن رہی تھیں۔

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" ڈولی نے دونوں کو مخاطب کیا۔

"میں ابھی اس کا حل نکالتی ہوں۔" یہ کہہ کر رانی نے منہ میں کچھ بڑبڑایا۔ اب اختر اور یاور اس کی آواز سن سکتے تھے۔ ڈولی جان چکی تھی کہ رانی کیا کرنے والی ہے۔

"تم دونوں تیسری کتاب کے بارے میں پریشان ہو، میں یہ پریشانی دُور کر سکتی ہوں۔" رانی نے دونوں کو مخاطب کیا۔

"یہ کس کی آواز ہے؟" یاور نے اختر کو گھورا۔

"میں تو نہیں بولا۔" اختر نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔

"تو پھر کون بولا ہے۔"

"یہ میں بول رہی ہوں، شیلف کی طرف دیکھو۔" یہ جملہ سن کر دونوں نے شیلف کی طرف دیکھا تو خوف کی ایک لہر اُن کے جسموں میں دوڑ گئی۔

"بھ...... بھ...... بھو...... بھوت...... بھوت۔" اختر خوف کے مارے چلّایا۔

"میں بھوت نہیں، میں تو رانی ہوں، ہم سے خوف زدہ مت ہوں۔"

رانی کے اس جملے نے بھی دونوں کے خوف کو کم نہیں کیا تھا۔ دونوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے کتابوں کو گھور رہے تھے۔ خوف کے مارے اُن سے بات بھی نہیں ہو پا رہی تھی۔

"میرا نام ڈولی ہے، میں دونوں کو ملنے کے لیے آئی تھی۔" ڈولی کی بات سن کر دونوں بھوت بھوت کا شور مچاتے ہوئے زمین پر گر کر بے ہوش ہو گئے۔ دونوں کو بے ہوش دیکھ کر روشنی بولی۔

"ڈولی! تم ابھی اور اسی وقت جا کر عمر کو ان کے بے ہوش ہونے کی اطلاع دو، ان کو اس حالت میں گرفتار کروایا جا سکتا ہے۔"

''ہاں تم ٹھیک کہتی ہو، میں عمر کو ان کے بے ہوش ہونے کی اطلاع کرتی ہوں، تم دونوں یہیں رہو۔''

یہ کہہ کر ڈولی شیلف سے اتر کر باہر کی طرف بڑھی۔ وہ مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی عمر کے کمرے میں پہنچی۔ عمر اُس وقت دوپہر کا کھانا کھا کر سو رہا تھا۔

''عمر اٹھو، عمر اٹھو۔'' ڈولی نے بلند آواز سے کہا۔

عمر گہری نیند سو رہا تھا۔ ڈولی کے بار بار پکارنے کے باوجود وہ بیدار نہ ہوا۔ پھر ڈولی نے بیڈ پر چڑھ کر عمر کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''عمر اب اٹھ بھی جاؤ۔''

''کون ہے، کون ہے؟'' عمر بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''میں ڈولی ہوں۔''

''اچھا تو یہ تم ہو، تم کہاں سے آ رہی ہو؟''

''میں جگو کے اڈے سے آ رہی ہوں۔''

''جگو کے اڈے سے۔'' عمر نے دہرایا۔

''ہاں جگو کے اڈے سے، جلدی سے اپنے ابو جان اور انسپکٹر ذاکر کو اطلاع کرو کہ جگو کے دو ساتھی یاور اور اختر اڈے میں بے ہوش پڑے ہیں، جلدی سے یہ کام کرو۔'' ڈولی بولتی چلی گئی۔

عمر نے کوئی وقت ضائع کیے بغیر اپنے ابو جان کو ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ ابو جان کے ذریعے بہت جلد انسپکٹر کو بھی یاور اور اختر کے بے ہوش ہونے کے بارے میں پتہ چل گیا تھا۔

''اگر یہ اطلاع ڈولی نے دی ہے تو یہ اطلاع درست ہوگی، میں اسی وقت نفری لے کر جگو کے اڈے پر پہنچ رہا ہوں۔'' انسپکٹر ذاکر نے عمر کے ابو جان کا فون سننے کے بعد کہا۔

کچھ دیر بعد سپاہیوں نے جگو کے اڈے کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ دونوں ابھی تک بے ہوش تھے۔ انسپکٹر ذاکر نے پہلے اچھی طرح اڈے کا معائنہ کیا پھر وہ ایک سپاہی کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ رانی اور روشنی نے انسپکٹر ذاکر اور سپاہیوں کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا تھا۔

''دونوں کو ہتھکڑیاں لگاؤ۔'' انسپکٹر ذاکر نے فرش پر بے ہوش پڑے یاور اور اختر کو دیکھتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

جب ان کو ہتھکڑیاں لگ گئیں تو ان کو ہوش میں لانے کے لیے ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے۔ کچھ دیر بعد وہ خوف زدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

''اختر، ہم کہاں ہیں؟'' یاور نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''تم اس وقت پولیس کے مہمان ہو، بہت ہوگئی بدمعاشی، اب جیل کی ہوا کھاؤ۔'' سپاہی رب نواز نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

''پپ...... پپ...... پو...... پو...... پولیس۔'' اختر کی زبان سے جملہ بھی ادا نہیں ہو رہا تھا۔

''ہاں پولیس، چلو پولیس اسٹیشن۔'' انسپکٹر ذاکر چلائے۔

زمین سے اٹھتے ہوئے یاور نے شیلف کی طرف دیکھا تو وہاں اب دو کتابیں تھیں۔

''اختر! اب شیلف میں دو کتابیں ہیں، تیسری کتاب کہاں گئی ہے؟''

اس سے قبل کہ اختر، یاور کی بات کا کوئی جواب دیتا۔ ڈولی نے سیڑھیوں پر کھڑے کہا۔

''میں یہاں ہوں۔''

''بھو...... بھو...... بھوت...... بھوت۔'' اختر کی خوف زدہ آواز سن کر انسپکٹر ذاکر نے تحسین آمیز انداز میں ڈولی کو دیکھا کیوں کہ اس کے باعث دو خطرناک مجرم قانون کی گرفت میں آئے تھے۔

انسپکٹر ذاکر نے ایف آئی آر (فسٹ انفارمیشن رپورٹ) درج کر کے چالان مکمل کیا اور دونوں کو جیل بھیج دیا۔ دونوں سر جھکائے بیٹھے تھے کہ جگو نے اُن کو مخاطب کیا۔

''جرائم کے راستوں پر چلنے والوں کے ساتھ ایسا ہوتا رہتا ہے، جیل تو ہمارا دُوسرا گھر ہے، تم بے ہوش کیوں ہوئے تھے؟''

''استاد! وہ اڈے میں بھوتوں نے بسیرا کر لیا ہے، کیا کبھی کتابیں بھی بول سکتی ہیں!'' یاور بولا۔

''کیا مطلب؟'' جگو نے حیرت کا اظہار کیا۔

''اڈے میں نہ جانے کب سے ایک شیلف میں دو کتابیں پڑی تھیں......''

''ہاں...... ہاں وہ دو کتابیں میں لایا تھا۔'' راجو نے کچھ یاد کرتے ہوئے یاور کی طرف دیکھا۔

''اب شیلف میں دو کی بجائے تین کتابیں ہیں، ہم تیسری کتاب کا سراغ لگا رہے تھے کہ اچانک ایک کتاب باتیں کرنے لگی تھی۔'' اختر کی بات سن کر جگو نے کہا۔

''ایسا ہو ہی نہیں سکتا، ضرور تمہیں دھوکا ہوا ہے۔''

''ہم بھی تو یہی کہہ رہے ہیں کہ ایسا نہیں ہو سکتا، بھلا کبھی کتابیں بھی بول سکتی ہیں، ایسا تو بھوت ہی کر سکتے ہیں۔'' یاور یہ کہہ ہی رہا تھا کہ کھانا کھانے کا بلاوا آ گیا تھا۔ کتابوں کا ذکر سن کر راجو کو ماضی کی باتیں یاد آنے لگی تھیں۔ اُس نے بددلی کے ساتھ کھانا کھایا اور اپنی جگہ پر آ کر لیٹ گیا۔ نیند اُس سے کوسوں دُور تھی۔ وہ سکول میں ہونے والے اس تقریری مقابلے کو یاد کر رہا تھا جس میں اُس نے حب الوطنی کے موضوع پر تقریر کر کے پہلا انعام حاصل کیا تھا۔ اس کی پُر جوش انداز میں کی گئی تقریر کو سبھی نے بہت پسند کیا تھا۔

''شاباش ریاض بیٹے شاباش۔'' ماسٹر تجمل نے اُسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

''شکریہ سر، آپ کی محنت کے باعث میں یہ انعام حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔'' ریاض نے عاجزی سے جواب دیا۔

''آپ خود ذہین اور محنتی ہیں، میں ہر لمحہ آپ کی کامیابیوں کے لیے دُعا گو ہوں۔'' ریاض کافی دیر تک ماسٹر تجمل کے اس جملے کی بازگشت سنتا رہا۔ وہ بہت بے چین تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ جلد سے جلد یہاں سے چلا جائے۔ اس کے ساتھی خراٹے بھرتے ہوئے بے خبری کی نیند سو رہے تھے۔

''میں اپنی دُنیا میں لوٹ جاؤں گا، نیکی کی دُنیا، کتابوں کی دُنیا، انسانوں سے پیار کرنے کی دُنیا، حلال روزی کمانے کی دُنیا، یہ دُنیا میری دُنیا نہیں ہے، اے اللہ تعالیٰ میری مدد فرما، میری خطائیں معاف فرما دے، میرے گناہ بخش دے، میں اپنی دُنیا میں واپس جانا چاہتا ہوں، اے اللہ تعالیٰ میری دُعا قبول کر لے۔'' راجو کے دل کی دُنیا اچانک بدل گئی تھی۔ جیل میں رہ کر اُس نے نمازِ پنجگانہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کو ترجمہ اور تفسیر سے پڑھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ اس تبدیلی کو سب نے محسوس کیا تھا۔

''لگتا ہے راجو ہمارا گروہ چھوڑنا چاہتا ہے۔'' یاور نے استاد جگو کے کان میں سرگوشی کی۔

''ایسا نہیں ہو سکتا، یہ ہمارا ہم راز ہے، اگر یہ ہمیں چھوڑنے کا سوچے گا بھی اسے اگلے جہاں پہنچا دوں گا، جگو جو کہتا ہے وہ کر گزرتا ہے۔'' راجو نے جگو کی بات سن لی تھی۔ وہ کروٹ لے کر دُوسری طرف منہ کر کے لیٹا ہوا تھا۔ پھر جگو، یاور اور اختر کافی دیر تک اس کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ راجو کو جرائم کی دُنیا سے نفرت ہو گئی تھی۔

صبح کے وقت جگو نے راجو کو گھورتے ہوئے کہا۔

''میں کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے تیور کچھ بدلے بدلے سے ہیں، کیا کوئی پریشانی ہے؟''

''میں اپنی دُنیا میں لوٹنا چاہتا ہوں......''

''اپنی دُنیا۔'' جگو نے راجو کی بات درمیان سے اچک لی تھی۔

''ہاں میں اپنی دُنیا میں واپس جانا چاہتا ہوں۔''

''اب یہی تمہاری دُنیا ہے، جرائم کی دُنیا میں آنے کے تو بے شمار راستے ہوتے ہیں، مگر یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں، یہ خواب دیکھنا چھوڑ دو ورنہ......''

''ورنہ کیا؟'' راجو بولا۔

''ورنہ کچھ ہاتھ نہیں آئے گا، اس دُنیا سے نکلنے کا خیال اپنے دل سے نکال دو، میں آئندہ یہ بات سننا نہیں چاہتا۔'' یہ کہہ کر جگو سگریٹ کے لمبے لمبے کش لینے لگا۔ راجو خاموشی سے اپنی جگہ جا کر لیٹ گیا۔ جگو کی باتیں اس کے دماغ پر ہتھوڑا بن کر برس رہی تھیں۔ وہ کافی دیر تک جاگتا رہا پھر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ رات کے آخری پہر کوئی اُسے آواز دے رہا تھا۔

''راجو! اٹھو...... راجو آنکھیں کھولو۔''

(راجو کو رات کے وقت کون بیدار کر رہا تھا؟ یہ جاننے کے لیے اگلی قسط پڑھیے)

انوکھا مقابلہ

نذیر انبالوی

نوبل سوسائٹی کی طرف سے مختلف اخبارات میں چھپنے والے اشتہار نے سب کو چونکا دیا تھا۔ اِس طرح کا اشتہار پہلی بار شائع ہوا تھا۔ چند سال قبل چھ آدمیوں نے بچوں کی اخلاقی تربیت اور کردار سازی کے لیے نوبل سوسائٹی کی بنیاد رکھی تھی۔ سوسائٹی کے بانی صدر انجم عارف تھے۔ سوسائٹی کے زیرِاہتمام مختلف مقابلوں کا باقاعدہ انعقاد کیا جاتا تھا۔ اخبارات میں شائع ہونے والا اشتہار ایک انوکھے مقابلے کے حوالے سے تھا۔ اس انوکھے مقابلے میں شامل ہونے کے لیے حتمی اُمیدواروں کا فیصلہ تحریری ٹیسٹ اور انٹرویو کے ذریعے ہونا تھا۔ تحریری ٹیسٹ والے دن نوبل سوسائٹی کے دفتر میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ انجم عارف اس انوکھے مقابلے میں شامل ہونے والے بچوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ اُن کی توقع سے کہیں زیادہ بچے آئے تھے۔

"کیا سب انتظام مکمل ہیں؟" انجم عارف نے راحت علی سے دریافت کیا۔

"جی...... جی...... سب انتظامات مکمل ہیں، بس ابھی تھوڑی دیر میں تحریری ٹیسٹ شروع ہو جائے گا۔" راحت علی نے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد تحریری ٹیسٹ شروع ہوا۔ دُوسری رو میں حارث بھی سر جھکائے ٹیسٹ دینے میں مصروف تھا۔ جب وہ ٹیسٹ دے کر باہر آیا تو ابا جان اُس کے منتظر تھے۔

"کیسا ہوا ہے ٹیسٹ؟" ابا جان نے پوچھا۔

"بہت اچھا، سب سوال آسان تھے، میں آسانی سے پاس ہو جاؤں گا۔" حارث پُراعتماد لہجے میں بولا۔

"ان شاء اللہ، آؤ ابھی ہم نے بدھ بازار بھی جانا ہے۔" ابا جان بولے۔

بدھ بازار میں خاصا رش تھا۔ یہ بازار گول باغ میں ہر بدھ کو لگایا جاتا تھا۔ سردیوں کے باعث بدھ بازار میں خشک میوہ جات کی کئی عارضی دُکانیں بھی بنی تھیں۔ ابا جان جب مونگ پھلی لے رہے تھے تو حارث نے آنکھ بچا کر دو اخروٹ اپنی پینٹ کی جیب میں ڈال لیے تھے۔ وہ جس دُکان پر بھی گئے حارث وہاں سے کچھ نہ کچھ اٹھا کر اپنی جیب میں ڈالتا رہا۔ جب وہ گھر پہنچا تو اُس کی پینٹ کی دونوں جیبیں مختلف چیزوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اُس نے اپنی میز کی دراز میں ان چیزوں کو رکھ لیا۔ وہ بدھ بازار میں اسی مقصد کے لیے جاتا تھا۔ بازار سے چرائی اشیاء کو وہ سارا ہفتہ مزے لے لے کر کھاتا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اخروٹ توڑ کر اس کی گری کھائی جائے۔ وہ بغیر شور کیے اخروٹ کی گری کھانا چاہتا تھا تاکہ گھر میں کسی کو اس کی بُری حرکت کا پتہ نہ چل سکے۔ اُس نے اخروٹ کو دانتوں تلے دبا کر توڑنے کی کوشش کی تو اس کوشش میں وہ اخروٹ تو نہ توڑ سکا البتہ اس کی زبان دانتوں تلے آکر زخمی ہو گئی تھی۔ زبان سے خون نکلنے لگا تھا۔ وہ کلی کرنے کے لیے باتھ روم کی طرف بڑھا تو کرسی سے ٹکرا کر اوندھے منہ گر پڑا۔ گرنے سے اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ اُس نے اسی عالم میں زمین پر گرے اخروٹ کو دیکھا تو اسے

محسوس ہوا کہ جیسے وہ اُسے کہہ رہا ہو مجھے توڑنا اتنا بھی آسان نہیں۔
باتھ روم سے کلی کرنے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر اخروٹ توڑنے میں جت گیا۔ وہ ہر حال میں اخروٹ کی گری کھانا چاہتا تھا۔ اب وہ اخروٹ کو دانتوں کی بجائے اپنے سٹیل کے فٹ سے توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کوشش میں اس کی انگلی بھی زخمی ہو گئی تھی۔ آخر غصے میں آ کر اس نے اخروٹ پوری طاقت کے ساتھ فرش پر دے مارا۔ اس کی اس حرکت سے اخروٹ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ فوراً اخروٹ کی گری نکال کر کھانے لگا۔ اگلے ہی لمحے اُس نے کڑوی گری زمین پر تھوک دی۔ اتنا خوب صورت اخروٹ اور اتنی کڑوی گری۔ اس کی ساری محنت رایئگاں گئی تھی۔ زخمی زبان، ہونٹ اور ہاتھ کو لیے وہ افسردہ سا اپنے بیڈ پر لیٹ گیا۔

وہ منگل کا دن تھا جب حارث انوکھے مقابلے کے حتمی اُمیدواروں میں شامل ہونے کے لیے انٹرویو دینے نوبل سوسائٹی کے دفتر گیا تھا۔ صرف دس بچوں کا اس انوکھے مقابلے میں انتخاب کیا جانا تھا۔ جب حارث انٹرویو کے لیے کمرے میں داخل ہوا تو انجم عارف اپنی کرسی پر بیٹھے تھے۔ علیک سلیک کے بعد انہوں نے کہا۔

''میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ نے تحریری ٹیسٹ میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے ہیں۔''

''شکریہ سر!'' حارث بولا۔

''اب میں جو پوچھوں گا اُس کا آپ کو سچ سچ جواب دینا ہو گا۔'' انجم عارف نے حارث کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی میں سچ ہی بولوں گا۔''

''یہ بتایئے کہ کیا آپ نے کبھی جھوٹ بولا ہے؟''

''جی کئی بار، میں اتنی بار جھوٹ بول چکا ہوں کہ اب یاد بھی نہیں ہے کہ جھوٹ کب اور کہاں بول چکا ہوں۔'' حارث نے جھوٹ بولنے کے بارے میں سچ سچ بتا دیا تھا۔

''کیا کبھی چوری کی ہے؟'' انجم عارف کے سوال پر حارث سوچ میں گم ہو گیا۔ وہ ہر بات سچ سچ بتانے کا وعدہ کر چکا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ بولا۔

''میں یہ بُری حرکت کئی بار کر چکا ہوں۔''

پھر اُس نے بدھ بازار سے چوری کیے اخروٹ کی کہانی عارف انجم کو سنا دی۔ کمرے میں کافی دیر تک خاموشی طاری رہی۔ حارث نے آج پہلی بار کسی کے سامنے اعتراف جرم کیا تھا۔ اُسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ انٹرویو میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔

''اب آپ جا سکتے ہیں، شام تک انوکھے مقابلے میں شامل ہونے والوں کی لسٹ آویزاں کر دی جائے گی۔'' انجم عارف نے سکوت توڑا تھا۔ حارث بوجھل قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔ شام کے وقت لسٹ لگی تو اُس میں اس کا نام شامل تھا۔ جب وہ ابو جان کے ساتھ گھر پہنچا تو وہ بہت خوش تھا۔ سب اُسے مبارک باد دے رہے تھے۔ نوبل سوسائٹی کی طرف سے ملنے والا بروشر اُس کے سامنے تھا۔ بروشر پر جلی حروف میں ''انوکھا مقابلہ'' لکھا تھا۔ اس مقابلے کو ''مقابلہ حسنِ اخلاق'' کا نام دیا گیا تھا۔ مقابلے میں شرکت کے لیے دس سے پندرہ سال کے بچوں کا انتخاب کیا گیا تھا۔ مقابلے میں شرکت کرنے والوں کی تین ماہ تک علانیہ اور خفیہ

طریقے سے حرکات کا جائزہ لیا جاتا تھا۔ تین ماہ کے بعد مقابلے میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے والے کو سونے کا تاج اور دس ہزار روپے نقد دینے کا اعلان کیا جاتا تھا۔ خفیہ رپورٹ کے باعث کسی اُمیدوار کو بھی مقابلے سے خارج کیا جا سکتا تھا۔ حارث نے مقابلے کے قواعد وضوابط کو پوری توجہ سے پڑھ لیا تھا۔ اُس نے خود کو اِس مقابلے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔

اتوار کو وہ اپنے کمرے میں موجود تھا کہ عصر کی اذان ہوئی تھی۔ امی جان نے اُسے مسجد جا کر نماز ادا کرنے کے لیے کہا تو وہ ہمیشہ کی طرح ٹال مٹول کرنے لگا۔ اس کا بیڈ سے اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ انوکھے مقابلے کا خیال آتے ہی وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اگر خفیہ نمائندے کے ذریعے نوبل سوسائٹی والوں کو اس بات کا علم ہو جاتا کہ اُس نے وقت پر نماز ادا نہیں کی تھی تو اُس کے نمبر کٹ جانے تھے۔ وہ کسی صورت بھی اپنے نمبر کٹوانا نہیں چاہتا تھا۔

وہ حسبِ معمول ابا جان کے ساتھ بدھ بازار میں موجود تھا۔ وہ مختلف دُکانوں پر گئے۔ حارث کے ہاتھ چیزیں چرانے کے لیے آگے بڑھے، مگر پھر خفیہ نمائندے اور نمبر کٹ جانے کے خوف کے باعث اُس نے فوراً ہاتھ پیچھے ہٹا لیے۔ اس کی پینٹ کی جیبوں میں اب چوری کی کوئی چیز نہ تھی۔ آج ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ مقابلہ حسنِ اخلاق کو شروع ہوئے ایک ماہ ہو چکا تھا۔ حارث میں آنے والی تبدیلیوں سے سبھی خوش تھے۔ امی جان کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی حارث ہے جو بات بات پر شور مچاتا اور بدتمیزی کرتا تھا۔ امی جان کو وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب حارث سکول سے واپس آیا تھا۔ وہ بستہ ایک طرف اُچھال کر بغیر ہاتھ منہ دھوئے کھانا کھانے لگا تو امی جان بولیں:

''حارث! بُری بات، ہاتھ منہ دھولو پھر کھانا کھانے کے لیے بیٹھو۔''

''میرے ہاتھوں کو کیا ہوا ہے، میرے ہاتھ صاف تو ہیں۔'' حارث نے چلّاتے ہوئے کہا۔

''حارث شرم کرو، کیا بڑوں کے ساتھ اس طرح بات کرتے ہیں۔''

''میں نہیں کھانا کھاتا۔'' یہ کہہ کر حارث نے سالن کی پلیٹ دیوار سے دے ماری۔ امی جان اُس کو پکڑنے کے لیے آگے بڑھیں تو وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ امی جان اُس وقت بہت افسردہ تھیں۔ حارث نے کمرے کا دروازہ بھی بند کر لیا تھا۔

''بیٹا! دروازہ کھولو۔''

''میں دروازہ نہیں کھولوں گا، میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔'' حارث چلّایا۔

''بیٹا! ضد مت کرو، باہر آؤ اور کھانا کھاؤ۔''

''میں باہر نہیں آؤں گا۔'' یہ کہہ کر حارث نے گل دان دیوار سے مار کر توڑ دیا۔

امی جان اُس وقت خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھیں۔ مقابلہ حسنِ اخلاق کے شروع ہوتے ہی حارث یکسر بدل گیا تھا۔ سونے کا تاج اور دس ہزار روپے کی انعامی رقم حارث میں انقلابی

تبدیلیاں لائی تھی۔

حارث شام کے وقت ٹیوشن سینٹر سے واپس آ رہا تھا کہ گولڈن بازار کے پاس اُس کے محلے کے لڑکے کتے کے پلے کو گلے میں رسی ڈالے تنگ کر رہے تھے۔ پلا جب ''چاؤں چاؤں'' کرتا تو سب قہقہے لگاتے، شور مچاتے۔ کچھ فاصلے پر کھڑی پلے کی ماں بچوں کو دیکھ کر غرا رہی تھی۔ وہ بھوں، بھوں کرتی جب لڑکوں کی طرف بڑھتی تو لڑکے پتھر اٹھا کر اُسے مارنے لگتے۔ پلا چاؤں چاؤں کا شور مچاتا ہوا بے بسی کے عالم میں اپنی ماں کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ اے پیاری ماں مجھے ان ظالم لڑکوں سے بچاؤ۔ حارث کو دیکھتے ہی دانیال بولا۔

''حارث! تم بھی آ جاؤ بہت مزا آ رہا ہے۔''

''پلے کو چھوڑ دو۔'' حارث کی بات سن کر ولید نے کہا۔

''کیوں چھوڑ دیں اسے، ہم یہ مزے دار کھیل ایک مدت سے کھیل رہے ہیں اور ہاں تم بھی تو اس کھیل میں ہمارے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے۔''

''ہاں، پہلے ایسا ہوتا تھا مگر اب ایسا......''

''مگر اب ایسا اس لیے نہیں ہوگا کہ تم نے سونے کا تاج اور دس ہزار روپے کا انعام حاصل کرنا ہے، لالچی کہیں کا۔'' ذیشان نے حارث کی بات بھی پوری نہ ہونے دی۔ بات چونکہ سچ تھی اس لیے حارث پلے کی چاؤں چاؤں کی آواز سنتا ہوا گھر کی طرف بڑھ گیا۔ حارث کی نگرانی جاری تھی۔ نوبل سوسائٹی کے خفیہ نمائندے اس کے گھر، سکول اور محلے میں آ کر معلومات حاصل کرتے رہتے تھے۔ خفیہ نمائندے کا اس کے سکول اور محلے کے دوستوں سے بھی رابطہ تھا۔ محلے کے دوستوں کی کوشش تھی کہ سونے کا تاج اور دس ہزار روپے کی انعامی رقم حارث کو نہ ملے۔ دانیال، ولید اور ذیشان جب سر جوڑ کر بیٹھے تو ولید بولا۔

''ایسا ہو سکتا ہے۔''

''وہ کس طرح؟'' دانیال نے سوال کیا۔

''ذرا کان اِدھر لاؤ۔'' جب ولید نے ترکیب بتائی تو دانیال بولا۔

''اب مزا آئے گا، اس طرح حارث کا سونے کا تاج اور دس ہزار روپے حاصل کرنے کا خواب چکنا چور ہو جائے گا۔''

جب نوبل سوسائٹی کے خفیہ نمائندے نے حارث کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ان سے رابطہ کیا تو ولید نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

''ہم آپ کو جو بتائیں گے اُسے سن کر آپ کو افسوس تو ہوگا، مگر جو سچ بات ہے وہ تو آپ کو بتانا ہی پڑے گی۔''

''ہوا کیا ہے؟'' نمائندے نے پوچھا۔

''پرسوں ہم گھر سے نماز پڑھنے کے لیے نکلے تھے، مگر......''

ولید نے ذرا سا توقف کیا تو نمائندے نے سوال کیا۔

''مگر کیا؟''

''مگر ہم سب بلیئرڈ کلب چلے گئے پھر وہیں سے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔''

''کیا حارث بھی تمہارے ساتھ تھا؟'' نمائندہ ہر بات ڈائری میں نوٹ کرتا جا رہا تھا۔

''ہم تو مسجد ہی جا رہے تھے، مگر حارث بلیئرڈ کلب جانا چاہتا تھا، ہم نے اُسے مقابلہ حسنِ اخلاق بھی یاد دلایا، لیکن اُس کا کہنا تھا کہ وہ بلیئرڈ کلب ہی جانا چاہتا ہے۔''

''اچھا تو یہ بات ہے۔'' نمائندے نے کچھ سوچ کر کہا۔
جب خفیہ نمائندہ وہاں سے رخصت ہوا تو تینوں نے ہاتھوں پر ہاتھ مارتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔ مقابلہ حسنِ اخلاق کو ختم ہونے میں پندرہ دن رہتے تھے۔ حارث نے اڑھائی ماہ خود پر جبر کر کے گزارے تھے۔ اُس کا دل چاہتا تھا کہ وہ چیخے چلائے، نماز کے وقت نماز پڑھنے کی بجائے سوتا رہے، جانوروں کو تنگ کر اُسے جو خوشی ملتی تھی وہ خوشی حاصل کرے۔ لوگوں کے گھروں کی کال بیل بجا کر انہیں تنگ کرے، بدھ بازار کی مزے دار چیزیں چرا کر اپنے کمرے میں چھپ چھپ کر کھائے، مگر وہ ایسا چاہنے کے باوجود کر نہیں رہا تھا، اُس کی نظر سونے کے تاج اور دس ہزار روپے پر تھی۔ اُس کو اپنی منزل قریب نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک ایک دن گن گن کر گزار رہا تھا۔ وہ اپنے اُوپر چڑھائے مصنوعی خول کے ساتھ لوگوں کو ملتا۔ انوکھے مقابلے کے ختم ہونے میں ایک ہفتہ رہتا تھا کہ رات کے پچھلے پہر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اُسے کسی کے رونے اور گڑگڑانے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ کمرے سے باہر آیا تو امی جان اپنے کمرے میں جائے نماز پر بیٹھیں گڑگڑا کر دُعا مانگ رہی تھیں۔
''میرے اللہ حارث کو اسی طرح نیک اور اچھا بچہ بنا رہنے کی توفیق عطا فرما، حارث میرا جگر گوشہ، میرا راج دلارا، اللہ اس کو نیکی کے راستے پر ثابت قدم رکھنا، میرے اللہ میرا حارث ہمیشہ ہمیشہ ایسا ہی بن کر رہے، اے اللہ میری دُعا قبول فرما لے، حارث کو نیک بنا دے۔''

یہ کہتے ہوئے امی جان کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ امی جان کی زبان سے نکلنے والا ایک ایک لفظ حارث کے دل پر اثر کرتا جا رہا تھا۔ امی جان کی خواہش کے سامنے اُسے سونے کا تاج اور دس ہزار روپے بہت معمولی نظر آنے لگے تھے۔
ایک ہفتہ بعد مقابلہ حسنِ اخلاق کی تقریبِ تقسیم انعامات میں اول انعام کے لیے حارث کا نام پکارا گیا تو اُس نے اسٹیج پر جا کر کہا:
''مجھے اس انوکھے مقابلے کا انعام پہلے ہی مل چکا ہے۔''
حاضرین نے جب اُس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ گویا ہوا:
''آپ سب میری بات پر حیران ہوئے ہیں، بات ہے بھی حیرت والی، تین ماہ قبل جب یہ انوکھا مقابلہ شروع ہوا تھا تو اُس وقت کے حارث اور آج کے حارث میں زمین آسمان کا فرق ہے۔'' پھر حارث نے اس انوکھے مقابلے کے باعث ہونے والی اخلاقی تربیت کا ذکر کرنے کے بعد دس ہزار روپے کی انعامی رقم ایک فلاحی ادارے کو عطیہ کر دی اور سونے کا تاج انجم عارف کے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔
''اس تاج کے صحیح حق دار انجم عارف صاحب ہیں۔'' اس کے ایسا کرنے کی دیر تھی کہ ہال تالیوں سے گونج اٹھا تھا۔ انجم عارف کی خوشی دیدنی تھی۔ ان کی کوشش کامیاب ہوگئی تھی۔ انوکھے مقابلے کے انعقاد کا مقصد بھی یہی تھا کہ بچے سونے کے تاج اور انعامی رقم حاصل کرنے کے بجائے صرف اور صرف اپنی اخلاقی تربیت پر توجہ دیں، آج حارث نے وہ مقصد حاصل کر لیا تھا۔ خفیہ نمائندے نے حارث کے دوستوں کی سازش کو بھی بے نقاب کیا تھا۔ تقریب میں موجود اس کے دوستوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔ حارث ان سروں کو زیادہ دیر تک جھکا ہوا دیکھنا نہیں چاہتا تھا اس لیے وہ اپنے دوستوں کی طرف بڑھا۔
''اپنے سر اٹھا لو اور اپنے ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو، چلو اُس راستے پر جس پر انوکھے مقابلے کے باعث میں اب چل رہا ہوں۔'' چند ساعتوں بعد تینوں کے ہاتھ اُس کے ہاتھ میں تھے۔ تینوں بھی حارث کے راستے پر چلنے کے لیے تیار تھے۔
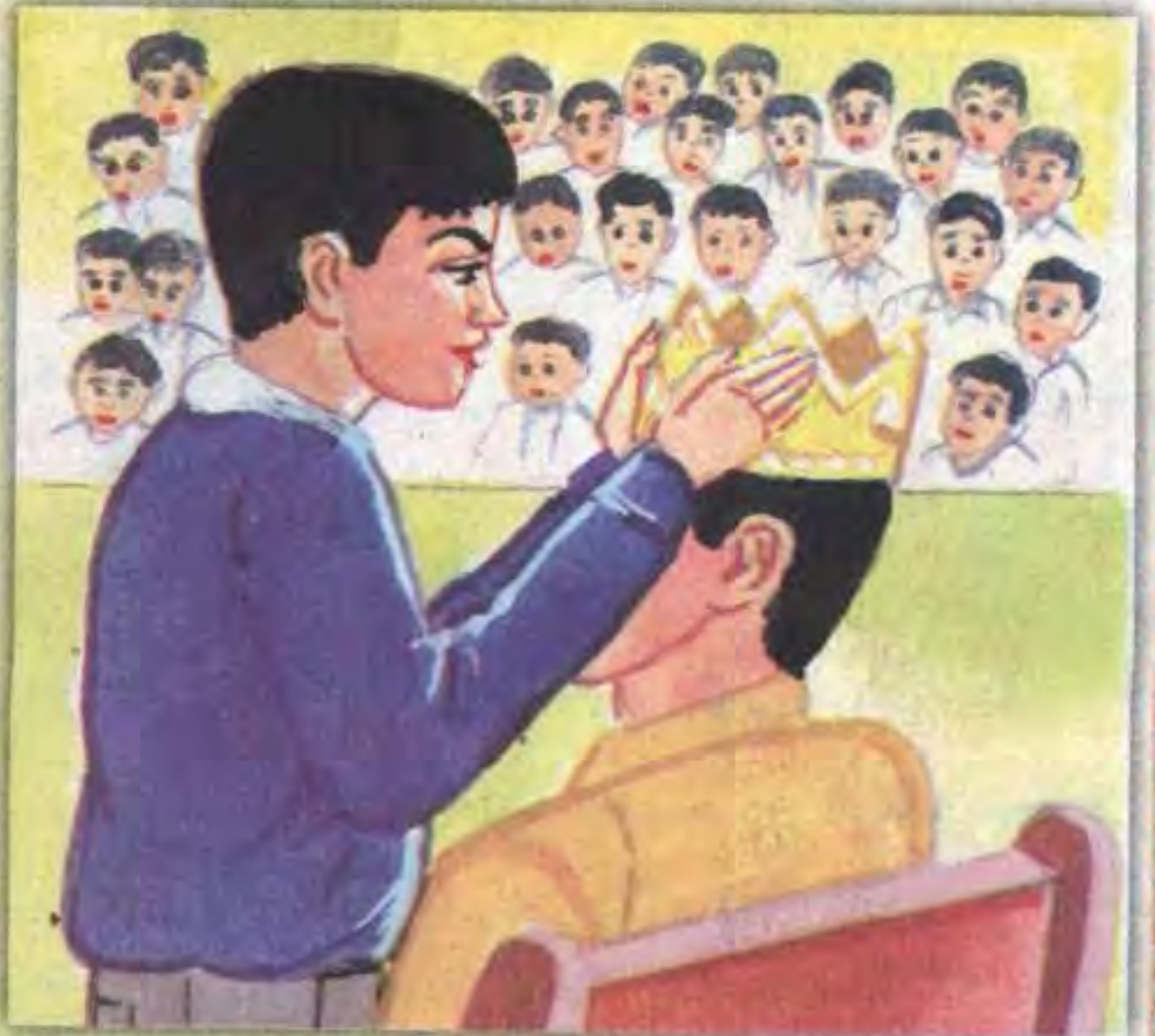
اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 دسمبر 2012ء ہے۔

نومبر 2012ء کے ''بلاعنوان کارٹون'' کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی **500** روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- سی این جی بچایئے، گدھا گاڑی چلایئے۔ (انصر علی، وہاڑی)
- پہلے گھر پہنچاؤ پھر چارہ ملے گا۔ (حلیم اسحاق، جہلم)
- باکمال انجن، لاجواب ڈبے۔ (راؤ عدنان اتفاق، سرائے سدھو)
- ڈیزل بچاؤ، اپنے لیے قوم کے لیے۔ (محمد طارق زمان، ڈیرہ اسماعیل خان)
- گھاس کھلاؤ، پٹرول بچاؤ۔ (انس احمد خان، کراچی)